
تیشۂ فرہاد
طفیل دارا

تیشۂ فرہاد

طفیل دارا

جدید ناشرین، چوک اردو بازار، لاہور

ضابطہ

حقوق ———— بحقِ مصنف محفوظ
طبع ———— اوّل
ناشر ———— اے۔ ایم خواجہ
مطبع ———— نقوش پریس، لاہور
سرورق ———— موجد
خطاطی ———— نثار زیدی
ماہ و سالِ اشاعت ———— جنوری ۱۹۶۹ء
قیمت ———— ۵/۰۰ روپے

جدید ناشرین، چوک اردو بازار، لاہور

تیشۂ فرہاد

جدید ناشرین

فہرست

انتساب ، ۱۱

مقدمہ ، عارف عبدالمتین ، ۱۳

برنگِ دگر ، مصنف ، ۱۷

غزل

عنقا ہے جہاں قوتِ بازو کی رسائی ، ۲۳

آقا مرے! واقف ہے تو ہر سود و زیاں سے ، ۲۵

حاکمِ وقت کے فرمان بدل جاتے ہیں ، ۲۶

میں تو جی لوں گا تری یاد کا پیکر بن کر ، ۲۸

ہم سے پہلے بھی اِس جگ میں پریت ہوئی ہے من ٹوٹے ہیں ، ۳۰

گو دور بھی غم، شاملِ غم ہو کے رہیں گے ، ۳۱

عمر مثلِ صدائے گدا ایک گئی ، ۳۲

راہرو کیا تھا تری راہگزر سے پہلے؟ ۳۳

ساحل کو میں چھوڑ آیا جو منجدھار کی خاطر ، ۳۵
دو گھڑی اُن کے ہاں گزار آئے ، ۳۶
ساتھ لاتے ہیں بُت کدوں کے صنم ، ۳۸
وہ جوانی جو دربدر نہ ہوئی ، ۴۰
ہر چیز کے سینے میں کوئی بول رہا ہے ، ۴۱
بہت اداس ہے عہدِ بہار کیا ہوگا ، ۴۴
مغربی سرمایہ داری لعنتِ شیطان ہے ، ۴۶
تیرے بچنے کو روک لوں کیسے ، ۴۷
عارضِ گل فشاں نہ زلفِ دراز ، ۴۸
غیروں کے ساتھ آج لکھا اُن کے نام کو ! ۴۹
فتنۂ اہلِ زر کے آنے سے ، ۵۰
خوں بھی کشید کر رگِ ابنِ تراب سے ، ۵۳
اُن کی محفل میں چلی ہے مرے افکار کی بات ، ۵۴
اب تو ہر بزم سے مقتل کی ہوا آتی ہے ، ۵۷
ملا دیا ہے مگر دردِ دل قیامت سے ؟ ۵۹
ظلم کے راز یہاں جب بھی رقم ہوتے ہیں ، ۶۰
جو پکڑ لیتے ہیں ، جھنکار نظر آتی ہے ، ۶۲
نت نئی قید کی تعمیر میں مصروف ہیں وہ ، ۶۳
پیچ گیسو کے تا کمر نکلے ، ۶۵

ہوس سے زر کی کھلا پاک دامنی کا بھرم ، ۶۷
وقت رک جائے تو تقدیر بھی تھم جاتی ہے ، ۶۹
رند میخانہ کے اب نام سے گھبراتے ہیں ، ۷۰
ظلم آموختہ تقریر یہاں بکتی ہے ، ۷۱
دل کی ویرانی میں ایسا بھی مقام آتا ہے ، ۷۲
عید یتیم ، شام غریب الوطن ہوں میں ، ۷۴
ہر مہوش کو بوسہ دینا، ہے یہ گہری بات ، ۷۵
نگہباں مجھ سے کہتا ہے ، ترے منہ میں زباں کیوں ہے؟ ۷۶
کس کو سمجھائیں یہاں ساقی کے پیمانے کی بات ، ۷۷
کیا دیکھے گا، انساں وہاں اپنی نظر سے ، ۷۸
حسنِ رم دیدہ تری یاد کا شہکار ہوں میں ، ۷۹
جانے کیا کہتے ہو تم عشق میں مرجانے کو ! ۸۰
قافلہ حسن کا ہر سمت رواں ہے ، یارو ! ۸۱
جو کچھ کیا ہے آپ نے بے جا نہیں کیا ، ۸۲
ٹوٹے گل، گل سے جدا ہے یارو ، ۸۳
برفاب زمیں ، تیرگی ، خاموش الافق ، ۸۴
یوں تو گردش میں ہیں یہ شمس و قمر برسوں سے ، ۸۵
وہ ایک عکسِ دل وجاں کہ روبرو بھی نہیں ، ۸۶
ضبط کر ضبط ، چھلک جائے نہ پیمانۂ غم ، ۸۷

مرے خیال تڑپتے ہیں کیوں بیاں کے لئے ، ۸۸
یہ ترا آتشیں رُخ ، نور کی کرنیں باہیں ، ۸۹
مفلسی میں بھی اگر پیار کئے جاتا ہوں ، ۹۰
وارداتِ جنوں سبھی برہم ، ۹۱
گلہائے چمن گم ہیں ، بہاروں سے نہ کہنا ، ۹۳
عشق میں خوتے غم کشی نہ گئی ، ۹۵
جب بھی دُنیا اداس ہوتی ہے ، ۹۷
اُس حُسن کی عظمت سے تو انکار نہیں ہے ، ۹۸
آغازِ گلستاں ویرانی ، انجامِ گلستاں کیا ہوگا ؟ ۹۹
چشمِ فسوں میں مستیٔ مے بار دیکھ کر ، ۱۰۰

نظم

پاک بھارت جنگ ۔ ستمبر ۱۹۶۵ء ، ۱۰۳
آخری ہمدرد ، ۱۰۵
ظلم ، ۱۰۷
سبھی سے دُور ، ۱۱۲
اُمیدِ فردا ، ۱۱۴
. . . کیا ناری کی ہیت ! ۱۱۵
باوری آشا ، ۱۱۶

پُرانے ناسور ، ۱۱۷
نگارِ وفا ، ۱۲۰
لاش ، ۱۲۲
تجدیدِ حیات ، ۱۲۵
پراگنی ، ۱۲۸

قطعہ ، ۱۲۹

فرد ، ۱۴۳

○

اپنی رُوح کی تنہائی کے نام

مقدمہ

طفیل دارا اکثر کہا کرتے ہیں کہ میں عارفؔ کے سوا کسی کی بات نہیں مانتا اور میرا معروضہ یہ ہے کہ طفیل دارا کی بات اور کوئی مانے یا نہ مانے، میں ضرور مانتا ہوں، کیونکہ مجھے اُن کی دارائی میں ہمیشہ ایک اندازِ دلربائی کا احساس ہوا ہے۔

اس معنوی اجمال کی لفظی تفصیل یہ ہے کہ انھوں نے مجھے اپنے اولین مجموعۂ کلام "تیشۂ فرہاد" کا "مختصر سا" مقدمہ لکھنے کا حکم دیا ہے، بہ الفاظِ دیگر انھوں نے مجھے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی ہدایت صادر فرمائی

ہے اور مندرجہ ذیل سطور تعمیلِ ارشاد کی ایک ایسی منکسرانہ سعی کی حیثیت رکھتی ہیں جس کے بلیغ یا غیر بلیغ ہونے کا فیصلہ بہر طور قارئین کو طفیل دارا کے جملہ من پاروں کے مکمل مطالعہ کے بعد، خود کرنا ہوگا!

طفیل دارا کی شاعری محبت، محنت اور غیرت کا نقطۂ اتصال ہے۔ وہ محبت کی خاطر کوہ بیستوں کو کاٹ کر جوئے شیر لانے کی ہمت رکھتے ہیں، لیکن اگر ان کی کاوش وجاں فشانی کے باوجود ان کی محبت کی بے حرمتی کی جائے تو وہ فرہاد کی طرح اپنے تیشہ سے اپنا ہی سر پھوڑ لینے پر آمادہ نہیں ہوتے بلکہ اسے مجرمِ محبت یعنی خسروِ وقت کے سر پہ دے مارنے کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "تیشۂ فرہاد" ان کے ہاں عشق، جانکاہی اور حمیت کی منفرد سہ پہلوی علامت بن کر ابھرا ہے!

میں طفیل دارا کے صوتی نظام کی روح کو اس انداز سے بھی پیش کرنا چاہوں گا کہ ان کا کلام شیفتگی اور انقلاب کی دو توانا لہروں کا عکاس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی آواز بہ ظاہر دو متضاد لہجوں کی آئینہ داری کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ایک لہجہ لوچ، سوز و گداز اور خود سپردگی کی کیفیت کا نقیب ہونے کی بدولت سُریلی بانسری کی دلآویز لَے کا احساس دلاتا ہے اور دوسرا لہجہ گھن گرج، کڑے پن اور ناقابلِ تسخیر ہونے کے عزم کی علمبرداری کے باعث صورِ اسرافیل کا شعور بخشتا ہے۔ میں نے ان لہجوں کو بہ ظاہر متضاد اس لئے قرار

دیا ہے کہ ان میں ہر ذہین سامع (اور قاری) کو ایک داخلی ہم آہنگی اور یگانگت کا ادراک ضرور ہوگا۔ کیونکہ طفیل دارا کا انقلاب، انقلابِ بے سمت نہیں ہے۔ بلکہ اس کی ایک خاص متعین نہج ہے جو اس کے ڈانڈے بالآخر اس منزل سے ملا دیتی ہے جسے شیفتگی کہتے ہیں۔ میں طفیل دارا کے کلام کی ان دو متحرک کیفیتوں کو دو ایسے مضبوط اور رجان دار پہیئے تصور کرتا ہوں، جن کے اشتراکِ عمل کے فیضان سے ان کا وہ ہمنوا فنکار تھا ادب کی شاہراہ پر ہر آن رواں رہتا ہے، جس پر طفیل دارا کبھی مہابھارت کے کرشن جی کے روپ میں اور کبھی ایران کے فرماں روا دار یوش بلند کی صورت میں نہایت تمکنت و وقار سے کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ طفیل دارا کے کلام میں ہندی کے نرم و نازک اور عربی فارسی کے پُرشکوہ الفاظ کے بیک وقت عمل دخل کے اسباب کا سراغ ان کی شخصیت کے اسی دوگونہ پن ہی سے ملتا ہے!

طفیل دارا ایک واضح طبقاتی شعور کے مالک ہیں، جس نے انھیں بجا طور پر شدید قسم کا جانب دار بنا دیا ہے، اور اس جانبداری کے نتیجے میں ان کی آواز مجبور و مقہور طبقے کے ہاتھ میں ایک تیغ بے نیام کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ مگر اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے ہاں اس شعور کا ظہور طبیعیاتی واسطے کی بجائے مابعدالطبیعیاتی حوالہ سے ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی

انقلاب پسندی اُن اخلاقی و رُوحانی علائق سے ماورا ہی دکھائی نہیں دیتی جس کا فقدان ہماری انقلابی شاعری کا بالعموم طغرۂ امتیاز رہا ہے اور اسی سبب سے ان کا یہ شعری مُرقع جہاں ہمارے سوادِ اعظم کے لئے اس کے مخصوص مزاج کی بدولت مقابلۃً زیادہ پُرکشش اور وقیع ہوگا وہاں اپنی آفاقیت کے اعتبار سے وسیع تر قومی اور بین الاقوامی مطالبات کی تکمیل کا جمالیاتی وسیلہ بھی قرار پائے گا۔

عالم عبدالحسن

۹ر فروری ۶۹ء

بر نگِ دگر

آج کا انسان اپنی ہی لاش پر کھڑا اپنی فتح مندی کا نعرہ بلند کر رہا ہے۔ یہ اس کی مادہ پرستی کا پہلا انعام ہے۔ مشرق کو یہ مادہ پرستی مغرب نے بخشی ہے۔ قدیم عہد میں مشرق نے مغرب پر بالادستی حاصل کی، تو مغرب کو جہالت اور حیوانیت سے نکال کر اُسے بلند انسانی اقدار اور انسانیت کے تقدس سے روشناس کرایا۔ مغرب نے مشرق پر فتح پائی تو اِسے مادے کا غلام بنا کر انسانیت کو اس میں زندہ دفن کر دیا۔

موجودہ انسان اپنی تمام مادی فتوحات کے باوجود بے چین اور ہراساں ہے۔ اسے چین اور طمانیت صرف دو چیزیں عطا کر سکتی ہیں ـــــ ایک "دین" ـــ جو انسانی تاویلات سے پاک ہو ـــ دوسرا "فنونِ لطیفہ" ـ جو اخلاقی اقدار کے حامل ہوں ـــ اور مجھے یقین ہے کہ یہی وہ تیشہ ہے جس کے اعجاز سے آج کا فرہاد کوہِ بے ستوں کاٹ کر جوئے شیر نکال لانے پر قادر ہو سکے گا۔

محبیّ و محترمی خواجہ عارف عبدالمتین صاحب نے، اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوصف، سنہ ۱۹۶۲ء میں پہلی مرتبہ میرے کلام کو اصلاح بخشی اور اُسے "تیشۂ فرہاد" کا عنوان عطا کیا۔ کتاب بوجوہ منصۂ شہود پر نہ آسکی نتیجۃً سنہ ۱۹۶۸ء میں منظومات کے اضافے کے پیشِ نظر انھوں نے اصلاحِ مکرر سے نوازا اور مجموعے کا مقدمہ بھی عطا فرمایا اس کے لئے میں اپنے دل و دماغ کی انھیں گہرائیوں سے ان کے حضور ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں، جن سے میرے اشعار جنم لیتے ہیں۔

میں سید سرفراز احمد سہیلؔ بنارسی صاحب کا بھی صمیمِ قلب سے احسان مند ہوں، جنھوں نے اپنی ژرف نگاہی اور فنی مشوروں سے مجھے مستفید فرمایا۔

طفیل دارا

میری کتھا کے دو پہلو ہیں جگ چاہے تو سن سکتا ہے

میں نے اُن سے پیار کیا ہے، میں نے پل چھن دُکھ سہے ہیں

انساں کو مقہور بھی دیکھا، انساں کو مجبور بھی دیکھا

مجھ سے جب کچھ بن نہ پڑا، تو مجبوراً یہ شعر کہے ہیں

غزل

عنقا ہے جہاں قوتِ بازو کی رسائی
دارا وہیں کام آئی ہے توفیقِ خدائی

پھر کشمکشِ شورشِ افکار سے کہہ دو
انساں کی ہے دُنیا تو خدا کی ہے خدائی

یزداں سے لگاؤ نہ بشر سے ہے محبت
تقدیر ہماری ہمیں کس موڑ پہ لائی!

دولت نے محبت کا گلا گھونٹ دیا ہے
کیا سوچ کے یہ خلدِ زمیں ہم نے گنوائی!

ہے مقتلِ جذبات، شہادت گہہِ احساس
دل والوں کو دُنیا یہ کبھی راس نہ آئی

صدیوں کے ستم کش کے لئے مَیں نے ہمیشہ
پکڑا ہے قلم اور کبھی تلوار اٹھائی

غیرت نے جب آمادۂ پیکار کیا ہے
انسان نے زنجیر کی تلوار بنائی

جب دُنیا نے دیکھا ترے بکنے کا تماشا
کہتے ہیں نظر مَیں نے بھی اُس وقت اٹھائی

ہم جیسے بھی کچھ لوگ جہاں میں ہیں جو اب تک
توہینِ محبت کو سمجھتے ہیں بُرائی

ہم باغِ محبت کے ہیں وہ پھول کہ جن سے
گل چیں نے سدا کانٹوں کی بارات سجائی

۲۷ . ۱ . ۱۹۶۸ء

آقا مرے واقف ہے تو ہر سود و زیاں سے
حسرت ہے کہ کچھ میں بھی سنوں تیری زباں سے

اے وادیٔ کونین کے رہبر مجھے بتلا
کیا وقت کو نسبت ہے مری روحِ رواں سے؟

ہر ذرّے میں پوشیدہ ہے کیوں قوّتِ پرواز؟
کیوں زیست ٹپکتی ہے یہاں مہرِ تپاں سے؟

ہر جنبشِ پوشیدہ طلب گارِ نمو ہے
انساں کو سکوں ملتا ہے کیوں تاب و تواں سے؟

کیوں رازِ ازل آج بھی اک راز ہے آخر؟
فطرت ابھی جاگی نہیں کیوں خوابِ گراں سے؟

کیوں اب وہ مسلماں کی زباں پر نہیں آتی؟
جو بات ادا ہوتی تھی ذرّوں کی زباں سے

۰۶-۰۶-۱۹۶۸ء

میں تو جی لوں گا تری یاد کا پیکر بن کر
مَیں نہ ہوں گا تو تری ذات پہ کیا گزرے گی ؟

نہ تری زلفوں کے سائے نہ مرا دستِ طلب
اب کے میخانے میں برسات پہ کیا گزرے گی ؟

جب کوئی دیکھے گا تجھ میں مری اُلفت کے نشاں
سوچتا ہوں ترے جذبات پہ کیا گزرے گی ؟

دل میں مَیں، سینے میں دل، سینے پہ زردار کا سر
مجھ پہ کیا گزریگی ! اُس رات پہ کیا گزرے گی !!

تو گزر جائے گی بیگانہ سمجھ کر مجھ کو
پر نگاہوں کی ملاقات پہ کیا گزرے گی؟

ڈھل گئی مے نئے میخوار کے پیمانے میں
اے خدا! رندِ خرابات پہ کیا گزرے گی؟

مر گیا ہوں، مرے حالات نے مارا مجھ کو
دیکھنا یہ ہے کہ حالات پہ کیا گزرے گی!

۶/۱۹۶۷ ۵ . ۲۶

ہم سے پہلے بھی اِس جگ میں پیت ہوئی ہے، من ٹوٹے ہیں
جانے کتنے فرہادوں کے پربت پربت سر پھوٹے ہیں!

پیت نگر کی رام کہانی، تیرا جوبن، میرے نین
باقی اِس سنسار کے بندھن، میری سجنی، سب جھوٹے ہیں

روپ ملن کی آشا لے کر ہم نگری نگری گھومے ہیں
صدیوں آتش نراش کے لیے شام سویروں سے پھوٹے ہیں

برہا اور سنجوگ کتھائیں، مایا جال کی چنچلتائیں
ورنہ پریمی من بندھن میں اک دوجے سے کب چھوٹے ہیں

رنگیں سپنے دیکھنے والو، دیکھو تم بندھن تو نہیں ہو!
مجھ بندھن نے جتنے رنگیں سپنے دیکھے سب ٹوٹے ہیں

٢.١.١٩٥٩ء

گو اور بھی غم، شاملِ غم ہو کے رہیں گے
ہم فارغِ ہر رنج و الم ہو کے رہیں گے

بیباکیٔ تحریر، یہ دستورِ خداوند
اک روز مرے ہاتھ قلم ہو کے رہیں گے

اے مردِ سخن، جرمِ سخن، خوب ہیں، لیکن
یہ جرم ترے خوں سے رقم ہو کے رہیں گے

کعبے سے نکالے ہوئے بُت پوجنے والو!
کیا پھر یہ شناسائے حرم ہو کے رہیں گے؟

کہتے ہیں کہ ہر قطرۂ طوفاں کو دبا دو
قطروں کو یہ ضد ہے کہ وہ یم ہو کے رہیں گے

۱۱۔۱۲۔ ۱۹۵۳ء

عصمتِ نسلِ صدائے گدا بک گئی
بزمِ کوراں میں کوئی ادا بک گئی

آدمی نے تجارت کا بدلا چلن
آدمیت کے سر کی ردا بک گئی

کون کس کا ہے دنیا کے بازار میں!
میں جدا بک گیا، تو جدا بک گئی!

آدمی پھر بھی مفلس ہے محتاج ہے
ساری دنیا تری اے خدا بک گئی

اب نہ آئے گا کوئی خریدارِ دل
بنتِ حوا کی اک اک ادا بک گئی

۱۹۶۸-۸-۴ء

راہرو کیا تھا تری راہ گذر سے پہلے؟
جانے کس حال میں دُنیا تھی بشر سے پہلے؟

کون بتلائے کہ معذور رہے نطقِ انساں
حُسن کس رنگ میں تھا میری نظر سے پہلے!

ہم نے جنگل میں جلایا ہے الاؤ، لیکن
تیرگی خوف نہ تھی رقصِ شرر سے پہلے

خواب انسان کی فطرت کا تقاضا ہے، مگر
ختم ہو جاتی ہے ہر رات سحر سے پہلے

جادۂ عشق کی تکمیل بہت مشکل ہے
مرحلے اور ہیں آغازِ سفر سے پہلے

عفتِ حسن نے شوخی کو مقید رکھا
بحر زخّار ہے، غوّاص! گہر سے پہلے

ایک مفلس کی محبت کا جنازہ ہوں میں
اہلِ دل دیکھیں مجھے، صاحبِ زر سے پہلے

ڈھونڈنے والے محبت کو حسیں جلووں میں
اور بھی گزرے ہیں مجھ خاک بسر سے پہلے

تربتِ حسن پہ دو پھول چڑھالیں دارا،
ذکرِ گیسو و لب و خال و کمر سے پہلے

۲۹-۱-۱۹۶۲ء

—

ساحل کو میں چھوڑ آیا جو منجدھار کی خاطر
اُبھرے کئی طوفاں مرے دیدار کی خاطر

سر جھک گیا، ظالم! تری تلوار کی خاطر
لیکن نہ جھکا نقرئی جھنکار کی خاطر

خود دار تڑپتا ہے یہاں نانِ جویں کو
سب کچھ ہے، مگر حاشیہ بردار کی خاطر

ہے غرقِ نشاط اب وہ جہانگیریِ حرم میں
ہم آہ بلب جیتے ہیں جس پیار کی خاطر

میخانے میں جاں دے کے یہ روشن ہوا مجھ پر
روتا نہیں ساقی یہاں میخوار کی خاطر

نیرنگیِ گلشن کی نہایت ہے یہ دارا
ہر پھول مہکتا ہے یہاں خار کی خاطر

۴-۸-۱۹۶۵ء

دو گھڑی اُن کے ہاں گزار آئے
عشق کی عاقبت سنوار آئے

ہر نفس اک نیا تقاضا دم ہے
وقت ٹھہرے تو کچھ قرار آئے

کچھ تو ہو اہلِ دل کی دُنیا میں
مے ملے یا کہیں بہار آئے!

اپنا انجامِ زیست کیا ہو گا؟
ہم اگر موت کو بھی ہار آئے

تھک چکی ہے شعاعِ شمسِ کہن
روشنی کا نیا منار آئے

ہم ازل سے رواں تھے سوئے عدم
راہ میں اپنے ہی مزار آئے

ہر جگہ زیست کار فرما ہے
حشر تک موت کو پکار آئے

ٹھہرا ردِ عمل بھی ایک عمل
وقت لوٹے تو بار بار آئے

۰۴-۰۳-۱۹۶۸ء

ساتھ لائے ہیں بُت کدوں کے صنم
کیسے آئے ہیں پاسبانِ حرم!

پھر ہمیں وقت نے پکارا ہے
پھر سرِ دار آ گئے ہیں ہم

ظلم اک لفظ ہی سہی، لیکن
داستاں سے نہیں ہے یہ کچھ کم

ق

لُٹ گئی عصمتِ بہارِ چمن
لالۂ شعلہ رُخ ہوا مدّھم

غنچہ و گُل کسی نے لُوٹ لئے
باغ کو کھا گیا بہار کا غم

ہر کلی ایک بے کفن لاشہ
ہر روش صورتِ صفِ ماتم

ہم سے پوچھو کہ زندگی کیا ہے
ہم پہ گذرے ہیں حادثے پیہم

میرے احوال پوچھنے والو!
تم نے دیکھے ہیں گیسوئے برہم!

ہم تو جرمِ وفا کے خُوگر ہیں
تیرا رنگِ کرم ہے مشقِ ستم

کوئی ہنگامہ، کوئی رستا خیز
شورِ ہستی نہیں سکوتِ عدم!

۱۹.۱.۱۹۵۳ء

وہ جوانی جو دربدر نہ ہوئی
سیلِ دوراں ہوئی، گہر نہ ہوئی

جس کو فرقت زدہ سحر کہتے
اپنی دُنیا میں وہ سحر نہ ہوئی

میں نے اُن کو غدا بنا ڈالا
اور اُن کو مری خبر نہ ہوئی

تیری نظریں بدلتی رہتی ہیں
میری قسمت تری نظر نہ ہوئی

بے زبانوں کی کون سُنتا ہے
دل کے رونے سے آنکھ تر نہ ہوئی

قافلے لُٹ گئے ہیں منزل پر
میرِ منزل کو کیوں خبر نہ ہوئی؟

۱۷۔۱۔۱۹۵۱ء

ہر چپ کے سینے میں کوئی بول رہا ہے
خاموشیٔ اسرار بھی تقریر نما ہے

جولانیٔ افکار ہے مطلوبِ گلستاں
یہ موجِ صبا بھی کسی غنچے کی صدا ہے

ہے تیرے تبسّم میں نہاں برقِ نہاں سوز
سَو بار مرے ہاتھوں ترا پردہ اٹھا ہے

گر کر بھی ہے دل اوجِ ثریّا کے برابر
کیا جانیئے یہ کونسی رفعت سے گرا ہے!

دُنیا کے لئے میں کبھی اُلجھا ہوں خدا سے
یہ دہر کبھی میرے ہی ہاتھوں سے چلا ہے!

مانا کہ بہت تلخ تھے سقراط کے اوقات،
میں نے بھی تو حالات کا زہراب پیا ہے!

اے پیکرِ تصوّر! مری آنکھوں پہ عیاں ہو
میں غیر نہیں، کس لئے تُو مجھ سے چھپا ہے!

اس خسروی ماحول میں دل والوں سے کہہ دو
یاں شیریں نے فرہاد کا کب ساتھ دیا ہے!

ہم دونوں ملاقات کے طالب تو ہیں لیکن
میں پیکرِ خوشبو ہوں، وہ گل برگِ حیا ہے

دیکھو تو کرشمہ ہے ٹھکانوں کا بدلنا!
ہے رُخ پہ تمھارے تو مرے دل میں خدا ہے

زر تیرے لیے ہے، نہ کہ تُو زر کے لیے ہے!
یہ زر کی غلامی، ہوسِ زر کی سزا ہے

ق

گردش نے زمانے کی جُدا کر دیا مجھ کو
اُس کھیت سے جس سے یہ مرا جسم اُگا ہے

جو اشک کہ گرتا تھا مری ماں کی لحد پر
وہ اشک مری آنکھ میں برسوں سے رُکا ہے

۴۔۴۔۱۹۶۸ء

بہت اُداس ہے عہدِ بہار، کیا ہوگا!
نہ مے، نہ رقص، نہ کوئی نگار، کیا ہوگا!

مسیح دار پہ، انسانیت خموش خموش
ترا علاج، دلِ سوگوار، کیا ہوگا!

رگِ گلاب میں لرزاں ہے پیکرِ خوشبو
چمن میں اب کے، دلِ بیقرار، کیا ہوگا!

تغیّراتِ زمانہ سکوں شناس ہوئے
سکوں سے پھوٹے گا جو انتشار کیا ہوگا!

ہر ایک لمحے کی قسمت ہے خودکشی لوگو
نظامِ شمس ہے ناپائیدار کیا ہوگا!

جو کنجِ رُوح کی وسعت کو بھی سمجھ نہ سکا
وہ کائناتِ گراں سے دوچار کیا ہوگا!

بڑھی جو فکر تو تنہائیوں میں ڈوب گئے
ہوئے اَحد تو کوئی غم گسار کیا ہوگا!

میں آشیاں بھی جلادوں گا روشنی کے لئے
جو برگِ گُل نہ ہوا شعلہ بار کیا ہوگا؟

ہر اک کلی میں ہے جوشِ نمو کا خلدِ بریں
یہ خلد اگر نہ ہوا آشکار، کیا ہوگا؟

نظر نے جس کی جھلک چھو کے پالئے کونین
تمہیں کہو کہ وہ رشکِ نگار، کیا ہوگا!

جمالِ درد ہوں، سایہ ہوں اپنی یادوں کا
مرے وجود کا اب اعتبار، کیا ہوگا!

کہیں سے ڈھونڈھ نکالو کسی پیمبر کو
یہ دورِ کفر ہے، خود شرمسار کیا ہوگا!

۲۹-۳-۱۹۶۸ء

مغربی سرمایہ داری لعنتِ شیطان ہے
ہر نگر کے مفلسوں کی موت کا سامان ہے

رہنماؤں کے کرشمے بہروپ سے نالاں ہوں میں
دل میں ہے ملّت فروشی ہاتھ میں قرآن ہے

اجنبی رہبر لئے جاتے ہیں ہم کو جس طرف
راہ تو آباد ہے منزل مگر ویران ہے

چاند کو آباد کرنے میں وہی مشغول ہیں
ہیروشیما جن کے ہاتھوں وادیٔ ہیجان ہے

۱۱-۰۸-۱۹۵۶ء

تیرے بکنے کو روک لوں کیسے
اہلِ دل ، اہلِ زر نہیں ہوتے

پھول جو غم کدے میں کھلتے ہیں
وہ کسی شاخ پر نہیں ہوتے

دل بھری بزم میں بھی تنہا ہے
ساریاں ہم سفر نہیں ہوتے

راہ سے دور راستہ نہیں کھوتے
وہ اگر بام پر نہیں ہوتے

حُسنِ رفعت نواز تا ہے جنہیں
ہم سے بے بال و پر نہیں ہوتے

۱۶-۱۱-۱۹۵۹ء

عارضِ گل فشاں، نہ زلفِ دراز
آسرے چھن گئے بہاروں کے

اب ہمیں کون یاد کرتا ہے!
قافلے لٹ گئے اشاروں کے

مفلسی ذات بنتی جاتی ہے
بک گئے جام میگساروں کے

حسن آواز دے کے بھول گیا
ہم دیے بن گئے مزاروں کے

اُن کی باہیں ہیں نور کی کرنیں
مرمری سائے ہیں ستاروں کے

۲۷۔۰۱۔۱۹۶۰ء

عزیزوں کے ساتھ آج لکھا اُن کے نام کو!
پینی پڑی ہے اوک سے پابندِ جام کو

جلنے سے پیشتر ہی دھواں اٹھ رہا ہے کیوں؟
کیا ہو رہا ہے، دیکھے کوئی دردِ خام کو!

میں ان کا ہوں غلام، وہ زر کے غلام ہیں
پوچھے ہے کون مجھ سے غلامِ غلام کو!

ممکن ہے کھِل کے زینتِ صد گلستاں بنے
کیوں توڑتے ہیں آپ گلِ ناتمام کو؟

اس چار دن کی زیست میں جینا حرام ہے
ہم کیا کریں گے لے کے حیاتِ دوام کو!

اک سمت رخشِ ظلم یونہی تو رواں نہیں
آخر کوئی تو تھامے ہوئے ہے لگام کو!

۲۹-۱۱-۱۹۵۷ء

فتنۂ اہلِ زر کے آنے سے
عاشقی مٹ گئی زمانے سے

سارے کردار مر گئے، لیکن
خوں ٹپکتا رہا فسانے سے

لُٹ رہا ہے جہانِ آب و گِل
فائدہ آسماں سجانے سے!

اُن کے جینے کا آسرا زر ہے
تو بھی جی لے کسی بہانے سے

درد ہوں اپنی نامتامی کا
کیا ملا اُن سے دل لگانے سے!

اک نیا لطفِ جاں نصیب ہوا
حُسنِ معصوم دل میں آنے سے

ق

زندگی ارتقائے انساں ہے
ماضی اور حال کو ملانے سے

کون آگے بڑھا ہے دُنیا میں
اپنے اسلاف کو بُھلانے سے

•

بے خطر پی کے لوگ آتے ہیں
محتسب کے شراب خانے سے

لوگ جینے سے ہو گئے باغی
زندگی! اک ترے ستانے سے

دردِ دوراں تو کم نہیں ہوتا
ایک سیمیں بدن کے پانے سے

جو نہ انساں بھی بن سکے، اُن کو
کیا ملے گا، خدا بنانے سے!

باغ کی تیرگی نہ دُور ہوئی
ایک جگنو کے جگمگانے سے

زد میں ہے پتھروں کی تاج محل
جھونپڑے اہلِ دل کے ڈھلنے سے

میں تو خوش پوش سا قلندر ہوں
دوستی اپنی ہے زمانے سے

۲۴۔۱۱۔۱۹۶۷ء

خوں بھی کشید کر رگِ ابنِ تراب سے
کیوں عطر ہی نکلتا ہے برگِ گلاب سے؟

جس سے کیا تھا اپنے بزرگوں نے کسبِ نور
برسے گی آگ، ہم پہ اُسی ماہتاب سے!

دیدار کی طلب کا زمانہ گزر گیا
رسمِ حجاب زندہ ہے، ذکرِ حجاب سے

طوفاں سے عمر بھر جو رہے تھے ستیزہ کار
اک بُلبلہ اُٹھا نہ سکے سطحِ آب سے

تم بزمِ اہلِ فکر میں آئے ہو، محتسب!
بچتی نہیں کسی کی یہاں پیچ و تاب سے

عہدِ رواں میں سبزہ و گُل کے نصیب میں
بالیدگی ہے جنبشِ عکسِ سحاب سے

۶۔۱۱۔۱۹۶۷ء

اُن کی محفل میں چلی ہے مرے افکار کی بات
فکر نے میری سُجھائی ہے مجھے دار کی بات

زردیٔ عارضِ دل، آج بھی باقی ہے مری
عمر بھر کرتا رہا عارضِ گلنار کی بات

فاصلے ختم ہوئے، جادہ بنا کوئے عدم
کس کو سمجھاؤں تری شوخیٔ رفتار کی بات!

آدمی نظمِ خدائی سے اُلجھ بیٹھا ہے
اب یہاں سجدے کی ہوتی ہے نہ زنّار کی بات

اپنی آواز سے بھی شاہ لرز اٹھتے ہیں
جب محلات میں ہو کوچہ و بازار کی بات

ساری دُنیا درِ مقتل پہ سمٹ آئی ہے
آمدِ سیل ہے کیا ہو در و دیوار کی بات!

اک تسلسل کے سوا کھیل میں کیا رکھا ہے
بے خبر کرتے ہیں کیوں جیت کی اور ہار کی بات!

کر رہا ہوں میں رگِ زیست سے پھر خون کشید
آئیگی اُن کے لبوں پر ابھی ایثار کی بات

ق

جانے کیوں فکر مری شعلہ فشاں ہوتی ہے!
جب بھی کرتا ہے کوئی خسروی دربار کی بات

تم اگر چاہو تو میں ناگ سے ڈسوا لوں گا
سامنے میرے نہ کرنا کسی زردار کی بات

○

یاد آئے مجھے وحشت نام سے اُٹھتے شعلے
جب بھی چھیڑی ہے غمِ دل نے قدِ یار کی بات

محتسب نغمۂ پازیب کا پابند ہوا
شہر کے لب پہ ہے زنجیر کی جھنکار کی بات

نہ مسرت کا تصور ہے، نہ غم کی تخئیل
زندگی اپنی ہے جیسے کوئی بیگار کی بات

۵-۱۱-۱۹۶۷ء

اب تو ہر بزم سے مقتل کی ہوا آتی ہے
موت ہر کوچہ و بازار پہ منڈلاتی ہے

مجھ کو ساحل کی تباہی کا خیال آتا ہے
جب کوئی موج کسی موج سے ٹکراتی ہے

زلف! اک روز جو وابستہ ہوئی تھی مجھ سے
آج وہ بازوئے زردار پہ لہراتی ہے

میرے سلطان! ترے حکم کی تعمیل میں آج
برق ہر رنگ میں کھلیانوں کو بہلاتی ہے

کس نئی رسم کی پابند ہوئی ہے دُنیا!
بُوئے گل، گُل سے وفا عشق سے شرماتی ہے

آہ ہونٹوں پہ جو آجائے تو رسوا کر دے
دل میں رہ جائے تو نغمات میں ڈھل جاتی ہے

ظلم کے بجتے ہوئے طوق و سلاسل پہ نہ جا
کبھی زنجیر کی تلوار بھی بن جاتی ہے!

۵۔ ۱۱۔ ۱۹۶۷ء

ہلا دیا ہے مگر دردِ دل قیامت سے؟
کہ بنھ رہی ہے زمانے سے اب مروّت سے؟

ہر ایک سمت سے آتی ہے نقرئی جھنکار
سُنے گا کون فسانہ لبِ محبت سے!

کسی سے مل کے مَیں کیوں وقفِ اضطراب ہوں!
ملا ہوں اپنے بھی دل سے کبھی رقابت سے

عوض میں دردِ جگر کے ملے تھے ہر دو جہاں
نہ جانے کیوں ہے یہ دل سرنگوں ندامت سے!

چمن میں ہر سے ہم کلی جب بھی مسکرا کے ملی
خزاں نے دیکھا ہے چھُپ کر وہیں شرارت سے

۲۸۔۱۰۔۱۹۶۷ء

ظلم کے راز یہاں جب بھی رقم ہوتے ہیں
ہونٹ سی دیتے ہیں، اور ہاتھ قلم ہوتے ہیں

چاندنی رات میں لطفِ رُخِ محبوب سہی
چاندنی رات میں بھی ظلم و ستم ہوتے ہیں

پھول کے سامنے بلبل کا لہُو بہتا ہے
باغباں جس گھڑی مائل بہ کرم ہوتے ہیں

اک نئے دَور کے افکار جنم لیتے ہیں
جب مرا سر، تری تلوار بہم ہوتے ہیں

کن کو راس آئی ہے، کیا جانیئے، یہ بزمِ طرب
جن سے ملیئے، وہی پروردۂ غم ہوتے ہیں

انقلاباتِ زمانہ ہوں جلو میں جن کے
ایسے انسان شناسائے الم ہوتے ہیں

اپنے احساس کو چھونے کی تمنّا نہ کرو
حادثے ہوتے ہیں، اِس رنگ میں کم ہوتے ہیں

۲۸۔۱۰۔۱۹۶۷ء

بُو پکڑ لیتے ہیں، جھنکار نظر آتی ہے
پھر بھی ہستی یہاں بیکار نظر آتی ہے

چاہتا ہوں کہ کہیں دُور نکل جاؤں، مگر
ہر طرف وقت کی دیوار نظر آتی ہے

کون ہے قاتلِ زنجیرِ ستم، کیا معلوم!
نہ کوئی ہاتھ نہ تلوار نظر آتی ہے

دہر کا دیدۂ بینا ہے فقط خود بینی
عقل، سوتے میں بھی بیدار نظر آتی ہے

آج انسان نے ہر قدر کو یوں بدلا ہے
آدمیت کی لگن، دار نظر آتی ہے

زندگی! پھر قدو کاکل میں کشش پیدا کر
خلق اب جینے سے بیزار نظر آتی ہے

کاٹ دیتے ہیں زباں خنجرِ منصب سے یہاں
ہم ہیں جب جرأتِ اظہار نظر آتی ہے

ہم بچھا دیتے ہیں رستے میں گلِ لذّتِ شوق
جب کوئی منزلِ پُرخار نظر آتی ہے

۳۔۱۱۔۱۹۵۷ء

نت نئی قید کی تعمیر میں مصروف ہیں وہ
کوئی بھی ہم میں خطاکار نہیں، کیا ہوگا؟

حدّتِ ظلم سے آہن بھی پگھل جاتا ہے
دُور تک سایۂ دیوار نہیں، کیا ہوگا!

اُن کو اصرار کہ ہیں میرے خداوند وہی
مجھ کو ضد، وہ مرے سرکار، نہیں، کیا ہوگا!

آج کیوں مجھ کو پلانے پہ مُصر ہے ساقی؟
آج ہی دعوتِ اغیار نہیں، کیا ہوگا!

محتسب، بھیس میں ساقی کے چلا آتا ہے
اور یہاں کوئی گرفتار نہیں، کیا ہوگا!

ہر طرف حُسنِ خود آگہہ کی فراوانی ہے
عشقِ معصوم خبردار نہیں، کیا ہوگا

۹۔۴۔۱۹۶۷ء

پیچ گیسو کے تا کمر نکلے
عشقِ بے پر کے بال و پر نکلے

حُسن پر مر مٹے ہیں اہلِ دل
اور خریدار، اہلِ زر نکلے

چاند تاروں کے راز داں اب تک
دل کے عالم سے بے خبر نکلے

رات میں لُٹ کے غرقِ حیرت ہوں
راہزن دن کے راہبر نکلے

اہلِ زر کے لئے جو پھُول بنے
اہلِ دل کے لئے شرر نکلے

ق

تہہ بہ تہہ چھا گئی ہے تاریکی
کس طرح آنکھ سے نظر نکلے!

منجمد ہو گئی ہے ظلمتِ شب
مہر صورت کوئی قمر نکلے

بجھ رہے ہیں چراغِ آخرِ شب
جھٹ پٹے سے کہیں سحر نکلے

ق

کیسے سمجھاؤں اہلِ دُنیا کو
کوئی مجھ سا نہ بے ہنر نکلے

میں ہی غیرت کا وہ جنازہ ہوں
جس کو لازم ہے عمر بھر نکلے

۷-۴-۱۹۶۷ء

ہوس سے زر کی کھلا یا کدامنی کا بھرم
بجھا بجھا ہے تقدس، لٹی لٹی مریم

مری نگاہِ تجسس کے پاس کچھ نہ رہا
قدم قدم پہ ہیں عریاں بدن کے پیچ و خم

مری نگاہ ترستی ہے دیکھنے کے لیے
کہاں ہیں کاکلِ خمدار و گیسوئے برہم؟

مری تڑپ ہی نمودِ حیات ہے میری
مرے نصیب کو راس آگیا ہے آپ کا غم

ہے جس کی ذات سراپا معانیٔ تقدیس
خدا کرے، مجھے حاصل ہو وہ نگارِ حرم!

تری تلاش میں گم ہوں میں اک زمانے سے
مثالِ موجہ و ساحل کبھی ملے تھے ہم

کسے خلوص و محبت کا واسطہ دو گے
کرم کہاں ہے! فقط رہ گئی ہے یادِ کرم

۲۱۔ ۱۰۔ ۱۹۶۶ء

وقت رُک جائے تو تقدیر بھی تھم جاتی ہے
وقت لمحات میں پلٹی ہوئی تقدیر تو ہے

کسی تربت پہ چڑھے، یا کہیں زلفوں میں سجے
پھول کی موت سہی، باغ کی تشہیر تو ہے

بزم میں شمع پہ پروانے کا یوں جل مرنا
مظہرِ زیست نہیں، زیست کی تطہیر تو ہے

نفسِ سرو سے بجھتی نہیں افکار کی لَو
کٹ گیا ہاتھ تو کیا، ہاتھ کی تحریر تو ہے

شاخِ گُل باقی ہے، گُل کھلتے ہیں، مُرجھاتے ہیں
عہدِ گُل جادۂ اوقات کا رہگیر تو ہے

اِذنِ تعمیر نہیں ہم کو اگرچہ دارا
ہم ہیں موجود مگر جذبۂ تعمیر تو ہے

۲۴ . ۷ . ۱۹۶۶ء

رند، میخانے کے اب نام سے کتراتے ہیں
مے سے گھبراتے ہیں اور ساقی سے شرماتے ہیں

کھیت کھلیانوں کو بھرنے پہ بھی رہتے ہیں جواں
رازقِ وقت ہمیں بھوک سے تڑپاتے ہیں

محتسب! سُنّتِ منصور ابھی زندہ ہے
آج بھی حق کے پرستار نکل آتے ہیں

۱۹۷۵-۰۳-۳۱ء

ظلم آموختہ تقریر یہاں بکتی ہے
سوچ کے پاؤں کی زنجیر یہاں بکتی ہے

وقت مظلوم کو باغی بھی بنا دیتا ہے
خون کے بھاؤ میں تقدیر یہاں بکتی ہے

جس کے کل جسم کا بھی کوئی خریدار نہ تھا
آج اُس شوخ کی تصویر یہاں بکتی ہے

کس سے فریاد کریں؛ کور ہے منصف کا شعور
تیری عصمت، مری تحریر یہاں بکتی ہے

لوگ چنگیز و ہلاکو کو بُرا کہتے ہیں
ساتھ ہی تیزئ شمشیر یہاں بکتی ہے

۱۹۔۸۔۱۹۶۵ء

دل کی ویرانی میں ایسا بھی مقام آتا ہے
دل کو بہلاتا ہوں میں، دل مجھے بہلاتا ہے

دل کے پیمانے کو کچھ سوچ کے لبریز کرو
اب تو یہ بھرنے سے پہلے ہی چھلک جاتا ہے

یاد کو میری فراموش نہ کر پاؤ گے
چند روزہ ہی سہی دل کا مگر ناتا ہے

حسنِ معصوم کی عفّت کا تقدس مت پوچھ
وہ تو خود میرے تصور سے بھی گھبراتا ہے

محتسب محفلِ دُزداں میں تھا کل تخت نشیں
آج ہر طالبِ انصاف کو دھمکاتا ہے

کیسی محفل ہے کہ ہر مے کا پرستار یہاں
مے طلب کرتا ہوا ڈرتا ہے، گھبراتا ہے

تیرے آئین میں چوری کا بھی ملتا ہے جواز
تیرا آئین تو ہر سانچے میں ڈھل جاتا ہے

۱۸۔۸۔۱۹۷۵ء

عیدِ یتیم ، شامِ غریب الوطن ہوں میں
جس میں نہ کوئی پھول کِھلا وہ چمن ہوں میں

غربت کے حادثوں نے عطا کی مجھے یہ شکل
اہلِ جہاں کے واسطے طُرفہ چلن ہوں میں

ہر مے پرست مجھ کو نہ مُنہ سے لگا سکا
تیزی میں اپنی بادۂ عہدِ کہن ہوں میں

میں جس جہاں کو خونِ جگر تک پلا سکا
اب اُس جہاں میں تشنہ کام و دہن ہوں میں

جلتا ہوں اپنی تیرہ نصیبی پہ بزم میں
کہتے ہیں لوگ روشنیٔ انجمن ہوں میں

۱۶-۸-۱۹۶۵ء

ہر مےکش کو بوسہ دینا ہے یہ گہری بات
میخانہ بتلائے کیا ہے پیمانے کی ذات

نوچ رہے ہیں لغزش کو میری کیوں دن اور رات
میں ماضی کی تاریکی میں ڈھونڈوں اپنی ذات

مَن میرا ماضی کا حصّہ، تن میرا ہے حال
دُنیا کو کیسے سمجھاؤں میں اپنے حالات!

جب حُسنِ شاداب کی دل میں سُنتا ہوں جھنکار
لمحہ لمحہ بن جاتا ہے، نغموں کی برسات

جس شب تیرا مول بڑھا تھا وہ ہے میرے ساتھ
تُو کہتی ہے بیت چکی ہے، برسوں سے وہ رات!

۹۔۸۔۱۹۶۵ء

نگہباں مجھ سے کہتا ہے، ترے مُنہ میں زباں کیوں ہے؟
قفس میں بند ہو کر بھی چمن کا رازداں کیوں ہے؟

مری دیوانگی سے کانپتے ہیں قیصر و کسریٰ
مرا اندازِ حق گوئی بھی باطل پر گراں کیوں ہے؟

یہ نغمہ میں نے تن من دھن کی قربانی سے پایا تھا
زباں میری رہی لیکن آج پابندِ فغاں کیوں ہے؟

۸۔۸۔۱۹۶۵ء

کس کو سمجھائیں یہاں ساقی کے پیمانے کی بات
ساری دُنیا سُن رہی ہے زر کے میخانے کی بات

ہر طرف زوروں پہ ہے بربادیوں کا کاروبار
بستیوں میں کس نے پھیلا دی ہے ویرانے کی بات!

سارے افسانے سے اپنے اس قدر بس یاد ہے
میری حسرت کی نظر اور تیرے شرمانے کی بات

بلبل و گلچیں میں ہے آشنا ازل سے اختلاف
پھول کھلنے کی تمنّا، پھول مرجھانے کی بات

خال پر جس کے سمرقند و بخارا تھے نثار
آج پھیلی ہے جہاں میں اس کے بک جانے کی بات

کیا خبر کس رنگ میں لکھتی ہو اب نزدہ ادا سے
اپنے بکنے کی حکایت، مجھ کو ٹھکرانے کی بات

۲۷ - ۷ - ۱۹۶۵ء

کیا دیکھے گا انسان وہاں اپنی نظر سے
ظلمات کی بارش ہو جہاں شمس و قمر سے

ہو جاتی ہے مظلوم کی فریاد کہاں گم
کہتا ہے فلک گزری ہے سو بار اِدھر سے

گلشن کو سجایا ہے چراغاں بھی کروں گا
بہنے دو ابھی اور لہو میرے جگر سے

کیا تم کو نہیں جنبشِ لب بھی مری منظور
کرتے ہو جدا قوتِ پرواز کو پر سے

ہے اب بھی اگر دہر میں زندہ کہیں انساں
کچھ سوزشِ پنہاں سے ہے کچھ دیدۂ تر سے

۲۶۔ ۷۔ ۱۹۶۵ء

حُسنِ رم دیدہ تری یاد کا شہکار ہوں میں
تُو ہے پازیب تو پازیب کی جھنکار ہوں میں

وقت کا قافلہ کب رُکتا ہے! کب تھمتا ہے!!
تُو اگر وقت ہے اُس وقت کی رفتار ہوں میں

میرے ارماں بھی بکے، تیری محبت بھی بِکی
یوسفِ عہد تھا، اب مصر کا بازار ہوں میں

ہر گلستاں کیلئے ابرِ چمن پرور ہوں
اپنے خرمن کیلئے برقِ شرربار ہوں میں

میں تڑپتا ہوں تو اوروں کو سکوں ملتا ہے
ہم سفر کوئی نہیں، قافلہ سالار ہوں میں

۱۰۔ ۷۔ ۱۹۶۵ء

جانے کیا کہتے ہو تم عشق میں مر جانے کو!
شمع خود جل کے جلا دیتی ہے پروانے کو

میری ہر بگڑی ہوئی بات سنور سکتی ہے
آپ اگر ہونٹ سے چھو دیں مرے پیمانے کو

محتسب دشمنِ جاں، رند بھی نالاں مجھ سے
میں بُرا کہتا ہوں انسان کے بِک جانے کو

میری مے بھی مجھے پینے کو نہیں ملتی ہے
ساقیا! آگ لگا دوں ترے میخانے کو!

سر بکف آئے ہیں مقتل میں اسیرانِ وفا
کچھ ضرورت ہے لہو کی ترے افسانے کو

زہر دے دیں مگر اس راز کو افشا نہ کریں
رو گئے یارو گئے!! اس ہاتھ کے تھرانے کو

۱۹-۳-۱۹۶۵ء

قافلہ حُسن کا ہر سمت رواں ہے، یارو!
جانے کیوں دل پہ یہ نظارہ گراں ہے، یارو!

خامشی جرم ہے، گفتار بغاوت اپنی
کوئی صورت ہو، یہاں جینا گراں ہے، یارو!

کاروانِ غمِ دل راہِ فنا میں ہے گُم
خامشی اپنی ہی منزل کا نشاں ہے، یارو!

ہم کو بخشا تھا جو قدرت نے سکوں روزِ ازل
کوئی بتلائے کہ وہ آج کہاں ہے؟ یارو!

شاخ پر لہکے تو تزئینِ بہاراں ہے گلاب
شاخ سے ٹوٹے تو تصویرِ خزاں ہے، یارو!

کس دُھندلکے میں مجھے چھوڑ گئی اس کی لگن
جس طرف آنکھ اُٹھاتا ہوں دُھواں ہے یارو!

۳۔۴۔۱۹۵۴ء

جو کچھ کیا ہے آپ نے بے جا نہیں کیا
ہاں ہم نے دل لگایا تو اچھا نہیں کیا

اُن سے اگر جوابِ محبّت نہیں ملا
ہم نے دلِ گرفتہ کا سودا نہیں کیا!

اپنوں کے ظلم کی ہو شکایت تو کس طرح
ہم نے تو دشمنوں کا بھی شکوہ نہیں کیا

وہ شاملِ گروہِ شہیدانِ غم ہوا
جاں دے کے جس نے جان کا چرچا نہیں کیا

۲۔۴۔۱۹۶۴ء

بوئے گُل، گُل سے جُدا ہے، یارو
یہ بھی گلشن کی ادا ہے، یارو

اُن کو کھو کر بھی ہوں زندہ اب تک
یہ بھی اندازِ وفا ہے، یارو

قصرِ چنگیز زمیں بوس ہوا
اک ستوں صرف بچا ہے، یارو

ہم ہوئے قتل کہ قاتل نہ رہا
دہر میں کچھ تو ہوا ہے، یارو

۲۴-۳-۱۹۶۴ء

بر فاب زمیں تیرگی ، خاموش الاؤ
کچھ اور نہیں ہے تو امنگوں کو جلاؤ

ہم حسبِ طلب خونِ جگر دیتے رہیں گے
اے مانیِ دوراں ! کوئی تصویر بناؤ

پروانۂ صفت جلنا ہے معراج ہماری
تم شمعِ صفت بزم کو پُر نور بناؤ

تا حدِ نظر قید کی دیوار کھڑی ہے
کرتے ہیں یہ دیوار اسیروں کا چناؤ

اے وقت کے منصورو! کہو تم بھی اناالحق
تجدیدِ فسانہ کے لئے سامنے آؤ

ہم خانہ بدوشوں میں شہنشہ نہیں ہوتے
اک نورِ جہاں سے کبھی اُلفت نہ جتاؤ

یوں تو گردش میں ہیں یہ شمس و قمر برسوں سے
ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں اپنی سحر برسوں سے

اُن کی زلفوں کے ہوں خم یا ہوں غمِ دہر کے پیچ
ہم تو ہر حال میں ہیں سینہ سپر برسوں سے

حُسن کو عشق کی تکمیل ہے منظور ابھی
منتظر میری ہے وہ راہگزر برسوں سے

رُو برو میرے کبھی آئینہ بن کر آجا
مجھ کو ملتی نہیں کچھ اپنی خبر برسوں سے

وہ کہاں اور کہاں مجھ سے تہی دست کا عشق
بزمِ زردار میں بجتے ہیں گھنگھر برسوں سے

سُنتے ہیں تھا کبھی عظمت سے شناسا داراؔ
اب تو لاہور میں ہے خاک بسر برسوں سے

۲۶-۱-۱۹۶۲ء

وہ ایک عکسِ دل و جاں کہ روبرو بھی نہیں
کہوں یہ کیسے کہ اب اس کی جستجو بھی نہیں!

گلہ خزاں کا تمنّا بہار کی کیسی!
کسی کلی کی زباں طالبِ نمو بھی نہیں

مقامِ سجدہ تو نزدیک ہے مگر دارا!
یہاں ابھی تو کوئی صورتِ وضو بھی نہیں

۱۶ - ۱۰ - ۱۹۷۱ء

ضبط کر ضبط، چھلک جائے نہ پیمانۂ غم
اُن کو منظور ہے خاموشیٔ میخانۂ غم

ہے مرے دور کی تاریخ میں میرا بھی لہو
مجھ پہ الزام نہ دھر، میں نہیں بیگانۂ غم

شمعِ دلداریٔ زر دار ہے اب بھی روشن
مفت میں جل گیا قلاش سا پروانۂ غم

کچھ ملاقاتوں سے، کچھ وعدوں سے کچھ یادوں سے
دل سجائے لئے پھرتا ہے پری خانۂ غم

۱۵۔ ۳۔ ۱۹۶۱ء

مرے خیال تڑپتے ہیں کیوں بیاں کے لئے!
کھڑی ہے موت یہاں جنبشِ زباں کے لئے

اُٹھیں کے ذوقِ تبسم سے بجلیاں برسیں
جو آئے تھے مری تعمیرِ آشیاں کے لئے

میں ایک کشتی ہوں، ساحل ہے موت میرے لئے
تڑپ رہا ہوں کسی بحرِ بیکراں کے لئے

وہ لامکاں، جسے فکر و نظر نے حُسن کہا
مچل رہی ہے جبیں اُس کے آستاں کے لئے

چلے گئے یہ مجھے اپنا پکارنے والے
ہزار دے گئے عنواں مرے بیاں کے لئے

۲-۳-۱۹۶۱ء

یہ ترا آتشیں رُخ، نور کی کرنیں باہیں
حسن والے میں ترے نام کی پُوجا کر لوں!

مہرباں ہو کے پلا دے گا کبھی خود ساقی
چند روز اور مے و جام کی پُوجا کر لوں

خونِ دل بکتا ہے اور بکتا رہے گا یونہی
دو گھڑی آ، لبِ گلفام کی پُوجا کر لوں

دیس میں میرے بھی بکتی ہے سحر کی رونق
مفلسی کہتی ہے مَیں شام کی پُوجا کر لوں

حُسن کی لاج رہے، اپنی بنے یا نہ بنے
قصرِ شیریں کے در و بام کی پُوجا کر لوں

۶-۲-۱۹۶۰ء

مفلسی میں بھی اگر پیار کئے جاتا ہوں
وقت کے سائے گرفتار کئے جاتا ہوں

آپ نے جرم کہا میری محبت کو حضور
میں اسی جرم کا اقرار کئے جاتا ہوں

تاکہ سمجھیں نہ مری لاش بھی لاوارث ہے
میں ترا ذکر سرِ دار کئے جاتا ہوں

دل کے جس نغمے نے برباد کیا عہدِ شباب
میں اسی نغمے کو بیدار کئے جاتا ہوں

آپ نے بخشا جسے مجھ کو بہ اندازِ کرم
دل کو اس درد کا مختار کئے جاتا ہوں

۱۸-۱۱-۱۹۵۹ء

واردات جنوں سبھی پر ہم!
ہائے یہ زندگی کے پیچ و خم!

زندگی جستجو کی نذر ہوئی
جانے کس موڑ پر ملیں گے ہم!

جو قدم اٹھ گیا وہ منزل ہے
جو قدم رک گیا وہ پیچ و خم

یہ بھی اک آپ کی عنایت ہے
ورنہ میں اور کہاں یہ آپ کا غم!

آج تک کشمکش ہے سجدوں میں
جانے کیا کہہ گئے بُتانِ حرم!

ایک قطرہ صدف کو ہے درکار
کب برستا ہے دیکھیں ابرِ کرم!

۱۴-۵-۱۹۵۹

گُل ہائے چمن گم ہیں ، بہاروں سے نہ کہنا
یاروں کی عنایات ہیں ، یاروں سے نہ کہنا

جو کہنا ہو کہہ لو ، ابھی زندہ ہیں یہ قیدی
مرجائیں تو کچھ ان کے مزاروں سے نہ کہنا

پابندیٔ گفتار کا آیا ہے زمانہ
ہم صورتِ محبت ہیں نگاروں سے نہ کہنا

ہر راہ سے کہتے ہیں یہ پُر ہول اندھیرے
منزل ہے کہاں قافلہ داروں سے نہ کہنا

ساحل بھی ہیں طوفانِ حوادث کے ثنا خواں
ہم ڈوب کے اُبھریں گے، کناروں سے نہ کہنا

امداد طلب خوابوں کے اٹھتے ہیں جنازے
ڈھتے ہوئے تاریک سہاروں سے نہ کہنا

ہم قوتِ تعمیر سے معمور ہیں دارا
افسانۂ تخریب، ستاروں سے نہ کہنا

۱۹۵۷-۳-۶

عشق میں خوئے غم کشی نہ گئی
عمر بھر شانِ بے خودی نہ گئی

چاند تاروں کی ضَو فشانی ہے
ہجر میں شب کی تیرگی نہ گئی

حاصلِ ذوق کیا ہے؟ اے مطرب!
تیری لَے کی فسردگی نہ گئی

قطعہ

تلخیٔ زیست کس نے دی مجھ کو؟
تلخیٔ زیست — جو سہی نہ گئی

مجھ کو کیا، اہرمن کہ یزداں تھا
میری فریاد کیوں سُنی نہ گئی

●

قطعہ ۲

یہ غمِ روزگار، یہ غمِ دل
ایک کی بھی تو سرکشی نہ گئی

سہہ لیے لاکھ ہم نے جور و ستم
پھر بھی امیدِ زندگی نہ گئی

•

داستاں مفلسی کی مفلس بن
ان خداؤں سے بھی کہی نہ گئی

دفترِ دہر میں ستم کے سوا
ہم سے تقدیر بھی پڑھی نہ گئی

۲۴-۴-۱۹۵۶ء

جب بھی دُنیا اداس ہوتی ہے
ہر قدم پر نگاہ روتی ہے

جانے کس کُنجِ رنگ و نکہت میں
گلستاں کی بہار سوتی ہے؟

اے خدا! دہر کے مظالم میں
کیا تری کچھ رضا بھی ہوتی ہے؟

ایک بے زر کی زندگی کیونکر
آبروئے حیات کھوتی ہے!

دے نمو کشتِ انقلاب اٹھیں
رات دن آنکھ اشک بوتی ہے

چُپ اے بُلبل کہ آج تیری صدا
گوشِ گُل پر بھی بار ہوتی ہے

۱۹۵۶-۴-۲۴

اُس حُسن کی عظمت سے تو انکار نہیں ہے
لیکن مجھے اب فرصتِ دیدار نہیں ہے

کیوں دستِ طلب روک لیا اہلِ جنوں نے؟
کیا دامنِ یزداں میں کوئی تار نہیں ہے؟

پاؤں بھی سلامت، ترا دامن بھی سلامت
کیا وادیٔ ہستی تری پُرخار نہیں ہے؟

ہر چند میں دُنیا کو حسیں کہتا رہا ہوں
ہاں تلخیٔ اوقات سے انکار نہیں ہے

ہے عکسِ تصوّر کا تماشائی ازل سے
دل روئے بُتاں کا تو پرستار نہیں ہے

شعلے کی لپک درسِ جنوں دیتی ہے دارا
وہ آنکھ ہے بیمار جو بیدار نہیں ہے

۷۔۷۔۱۹۵۵ء

آغازِ گلستاں ویرانی ، انجامِ گلستاں کیا ہوگا
اُس زلفِ پریشاں کا مارا اب اور پریشاں کیا ہوگا

زر بھی نہ رہا ، در بھی نہ رہا ، تم بھی نہ ملے اور دیس چھُٹا
اے جذبِ محبت ! تو ہی بتا پردیس میں ساماں کیا ہوگا؟

طوفاں کا تموّج حاصل ہے جو بخششِ یک قطرہ سے تجھے
جس بحر کا قطرہ طوفاں ہو، اس بحر کا طوفاں کیا ہوگا

زنداں کی عمارت پھیل گئی اور تم ہو کہ خوش ہو رقص میں ہو
اے آج کے قیدی انسانوں! کل قید کا انساں کیا ہوگا؟

اے برق تجھے خرمن کی قسم اک بار تو اتنا بتلا جا
اس شغل سے تجھ کو کیا حاصل ، اور حاصلِ دہقاں کیا ہوگا؟

۶-۱۲-۱۹۵۱

پاک بھارت جنگ

ستمبر ۱۹۶۵ء

اے میرے وطن! تیرے ہر اک ذرّے کی خاطر
مجھ جیسے ہزاروں کا لہو بہتا رہا ہے
مجھ جیسے ہزاروں کا لہو بہتا رہے گا
سرشارِ شہادت ہیں محمدؐ کے سپاہی

اے خونِ شہیداں تری سُرخی کی قسم ہے
اے عصمتِ مریم! تری عظمت کی قسم ہے
میں تیرے تقدس کے لئے لڑتا رہوں گا
دشمن کا جہاں زیر و زبر کرتا رہوں گا

خیبر ہو کہ لاہور ہو، حیدرؓ ہو کہ بھٹی
ہر رنگ میں فاتح ہے محمدؐ کا سپاہی
اے ابنِ علیؓ! ہم تری سُنّت نہیں بھولے
پھر خونِ مسلماں سے ملی حق کی گواہی!

آزادئ ملت ہو کہ آزادئ افکار
یہ شمع سدا خونِ شہیداں سے جلی ہے
اس زندہ حقیقت سے شناسا ہے یہ عالم
تاریخ اسی خون کے سانچے میں ڈھلی ہے

ہم دشمنِ دیرینہ کے ممنون ہیں، جس نے
توپوں کی گرج سے ہمیں ہشیار کیا ہے
اک خوابِ گرانبار کی آغوشِ سکوں میں
ہم سوئے ہوئے تھے، ہمیں بیدار کیا ہے

اے میرے عزیزو! ہو تہی دست تو پھر کیا!
جو ہاتھ لگے تم وہی ہتھیار اٹھا لو
توپوں کے بھروسے پہ تو پٹ جاتے ہیں کافر
ہم معرکے سر کرتے ہیں ایماں کے سہارے

آزادی کی قیمت ہی شہیدوں کا لہو ہے
ہم اپنے شہیدوں کا لہو دے بھی چکے ہیں
ہم اپنے شہیدوں کا لہو دیتے رہیں گے

ستمبر ۱۹۶۵ء

آخری ہمدرد

اے مری دُکھ بھری دُنیا کے خدا! بول کبھی
بولنا بارِ گراں کب سے ہوا تیرے لئے!
ہاں مگر تُو تو فقط دیکھتا ہے، سُنتا ہے، چُپ رہتا ہے
بولنا ریت ہے ہم دُکھ بھرے انسانوں کی

یوں تو اک دُنیا پہ سورج کا گزر ہوتا ہے
تیرگی ہے کہ شب و روز بڑھی جاتی ہے
طور کی ایک تجلّی کے سوا میرے لئے
آسمانوں میں ترے اور کوئی نور نہیں!

سوچتا ہوں تو بہت دُور نکل جاتا ہوں ـــــ
سب کو تاریک فضاؤں نے جنم بخشا ہے
نقرئی آب میں کچھ لوگ تو ڈھل جاتے ہیں
نقرئی آب سے محروم بشر اپنی طرح
نُور کے سانچوں میں ڈھلنے کی تمنّا بن کر
سُرمئی آب کے ظلمات میں بہہ جاتے ہیں

آ، مرے درد کو سینے سے لگالے اک بار
تلخیٔ زیست سے تُو بھی تو شناسا ہو جا
تیری جنّت رہے آباد سدا حوروں سے
میرے اس کلبۂ ویراں میں کبھی تو بھی اُتر

آسماں گیر حکومت ہے بڑی چیز مگر
بات ہے دہر میں یوں خاک بسر جلنے میں

۵-۳-۱۹۶۸ء

ظُلم

ظلم سہتے ہوئے جینا بھی کوئی جینا ہے!

میری ہمدم! مری محبوبۂ بلّور جمال!!
میرے پُر پیچ تصوّر کی گرانباری سے
اپنے معصوم خیالوں کو پریشان نہ کر
تجھ کو حاصل ہی نہیں میرے فرائض کا شعور

یہ ترا نرم نکھرتا ہوا جوبن، جس پر
ہر گھڑی ہوتی ہے نظروں کے گلوں کی بارش
آرزو پاش فسانوں ہی کی جلوہ گہہ ہے
تو نے سوچا کبھی، اے خلدِ تصوّر کی بہار!
میرے اس آہنی سینے کے لئے دشمن کی
گولیاں شام وسحر کرتی ہیں رستے کی تلاش!

ایک کہسار سے موجوں کا یہ دلکش ٹکراؤ
جس کی آواز سے شیروں کے جگر کانپتے ہیں!

یہ ترے مرمریں بازو جو اٹھیں گے جب بھی
میری گردن سے محبت سے لپٹ جائیں گے
اور ــــ یہ میرے صد آفات کے خوگر بازو
جب اُٹھے، ظلم کی فوجوں کو کریں گے تہِ تیغ

تیری گفتار ہے نغمات کی بارش لیکن
میری للکار ہے مظلوم دلوں کی شورش
تیری آنکھوں میں جہاں گلشنِ راحت ہے، مگر
میری نظروں میں ہے ناداروں کا مغموم نگر

میرے سینے میں ترا عشق ہے، انکار نہیں
ہے مگر دہر کے ہنگاموں میں روپوش کہیں

کیسے آرام کروں! کیسے مَیں خاموش رہوں!!
ہر طرف ظلم و ستم بڑھتے چلے آتے ہیں
جیسے چھپتے ہوئے خورشید کے لمبے سائے

ظلم سہتے ہوئے جینا بھی کوئی جینا ہے
سالہا سال سے ان خیرہ غلاموں کی طرح
جو کہ آزادی کے وعدوں کا سہارا لے کر
تلخیٔ رُوح کو تسکین دیے جاتے ہوں!

ظلم سہتے ہوئے جینا بھی کوئی جینا ہے!
ایسی واماندہ سی اک قوم کے مانند، جسے
اپنے مرکز کا تخیل بھی نہ بے چین کرے
اور ـــــ جیسے اپنے ہی اس خون کا احساس نہ ہو
دشتِ غربت میں جو بے سود بہے جاتا ہو!

ہے مرے گرد جو مغرب زدہ روحوں کا ہجوم
جس کی کورانہ سی تقلید پہ مجبور ہوں میں
کاش پہچان سکے اپنی حقیقت کا کمال
اور معلوم کہیں سے کر لے
اپنی مظلوم زبوں حالی کا جلتا ہوا راز!

کون کہتا ہے اسے غیروں کا پروردہ ستم!
جس کے باعث ہیں پریشان و شکستہ ہم لوگ!

اور۔ اس ظلم و جفا خیز فضاؤں میں ابھی
ظلم سہتے ہوئے لاچار جیئے جاتے ہیں
اے مری دوست! یہ ہیں اپنے ہی ہم ملک خداؤں کے اصول
جن کی دلدوز سی پابندی پہ مجبور ہیں ہم

اور ۔۔ جن کی موجودگیٔ زہر فشاں کے باعث
دستِ اغیار میں بے دام کھلونوں کی طرح
زندگی محرمِ آزار کئے جاتے ہیں

سینۂ دہر پہ پھیلے ہوئے مظلوموں کا
ظلمِ سرکش سے مری جاں، وہ تصادم ہوگا
جس میں پس جائیں گے مظلوم کی دُنیا کے خدا
اور ۔۔ اسی مقصدِ اعظم کے لئے آخرِ کار
تیرا دلدار ابھی رہے، یا نہ رہے، کیا معلوم!

آ ۔۔ کہ ہم بڑھتے ہوئے ظلم کے طوفانوں میں
ایک ایسا شجرِ تند و تن آور بن جائیں ۔۔
سینۂ دہر کی رعنائی کا اظہار کریں ۔۔
آشنا ہوتا نہیں خم سے کبھی جس کا وجود

ہاں — مگر پارۂ فولاد کے مانند، جسے
ٹوٹنے سے نہیں ہوتا ہے کسی طور گریز!

یہ غمِ دہر، غمِ عشق نہیں ہے، ہمدم!
اس میں اک دو نہیں، قوموں کا لہو بہتا ہے

۱۴-۱۰-۱۹۴۳

سجنی سے دُور

میرے نیناں، تیرا جوبن چھپ نہ سکیں گے اپنے چھُپائے
یہ دو پیت نگر کے پنچھی اُڑ آئے ہیں پنکھ لگائے

تو نے مجھ کو پیت سکھائی، مر مر کر جینا بتلایا
داتا تیرا ہو رکھوالا، جوبن لیلا جو دکھلائے!

سجنی! اب ہم مل نہ سکیں گے، جیسے اک مکھ کے دو نیناں
تجھ کو کھو کر، دکھ کو پا کر، بنتی نہیں ہے بات بنائے

مورکھ من کیا ڈھونڈھ رہا ہے، پیت چتا کی راکھ میں کیا ہے!
پھول بہے جو گنگا جمنا، پھر وہ کسی کے ہاتھ نہ آئے

پیت بسائے جگ بستا ہے، جگ سے بسی کب پیت کی نگری
جل ہر شئے کو کر دے پوتر، جل سے مٹی کون ہٹائے!

دیس بہاریں جھوم رہی ہیں، بگیا بگیا پھول رہی ہے
ندی نالے جھانک رہے ہیں، ساون ہر سو دھوم مچائے

محل میں راجا برکھا رُت سے "اوم" کی مالا پھیر رہا ہے
بن میں جوگی "ہری بھگون" کی پل چھن پل چھن ہانک لگائے

سکھیاں مل کر ماتا کے گھر، پیپل جھولا جھول رہی ہیں
پر اک ناری، ساس کی ماری، پانی لیکر گھاٹ سے آئے

ہاتھ سے گاگر تھامے گوری ، رہ پر پاؤں پھسلا جائے
دھیرے دھیرے پگ دھرتی ہے ، پانی پھر بھی چھلکا جائے
تن کے کپڑے بھیگ چکے ہیں ، ہر اک انگ سے جوبن چھلکے
دیوی لاج سے سمٹی جائے ، رہ چلتی ہے نین جھکائے
جگ سمجھے گاگر کا پانی چھلک چھلک مکھ پر بکھرا ہے
میں جانوں پی کی برہا نے دکھیا کے نینن چھلکائے
کیا بھگوان اسے بھی تو نے اپنے پی سے دور کیا ہے؟
گئو ہے میرے دیس کی ناری ، کس کو من کا روگ بتائے!
میری سجنی بھی ایسے میں گھاٹ سے پانی لاتی ہوگی
میرا من بھگوان نہیں جو دیکھے جگ میں یہ اپنائے
توڑ دے ناری ! گاگر اپنی ، صدیوں کا جنجال پرانا
نا ہو گوری گاگر تیری ، نا تو گھاٹ سے پانی لائے

۲۴-۱۲-۱۹۵۰ء

اُمیدِ فردا

قدم بڑھائے چلو، کارواں کے ساتھ رہو
نئی بہار لئے گلستاں کے ساتھ رہو

نمودِ صبحِ گلستاں کی آرزو کیوں ہو!
خلوصِ ہمدم و دورِ رواں کے ساتھ رہو

فروغِ بزم اسی میں ہے، مے ملے نہ ملے
اگر ہو رند تو پیرِ مغاں کے ساتھ رہو

بہت محال سہی شیوۂ چمن بندی
خزاں کا جبر سہو، باغباں کے ساتھ رہو

تڑپ کے حلقۂ ہستی کو توڑنے والو
فضائے زیست میں بارِ گراں کے ساتھ رہو

بلا سے چہرۂ خورشید پر نقاب رہے
دل و نظر کی حسیں کہکشاں کے ساتھ رہو

کبھی ہماری تمنّا بھی مُسکرائے گی!
کبھی تو منزلِ مقصود مل ہی جائیگی!

۲۸-۲-۱۹۵۷ء

کیا ناری کی پیت!...

کیا ناری کی سنگت پریمی، کیا ناری کی پیت!
یہ وہ کھیل ہے جس میں پیارے جیت کی ہونے ہار
جو بھی پیت کرے پچھتائے جو نہ کرے للچائے
دونوں اور ہے کاٹ روپ کی، دو دھاری تلوار

پل میں تولہ، پل میں ماشہ، پورا کرے نہ بول
ریت گھروندا، بالک کھڑا، پانی کی دیوار
جھوٹی تیری آس ہے مورکھ جھوٹا ہے وشواس
جا کر جوگی ندی نہ ٹوٹے، کیوں ٹوٹے گی تار!

تیرے سپنوں کی مورت نے ناری روپ دکھایا
تو ہی ساجن، تو ہی سجنی، تو ہی پیت نکھار
تیرے نیناں ردپ کے داتا من تیرا ہے روپ
ناری اپنا کھوٹ چھپائے کر سولہ سنگھار

اس کو تجھ سے بھید اکر کے تیرا من برمایا
وہ تیرا اوتار ہے یا ہے تو اس کا اوتار!

۲۱-۷-۱۹۵۵ء

باوری آشا

کاش ! مری بستی کو کوئی جینے کا احساس دلا دے !
ساحل ساحل سونے والے دریا کو بہنا سکھلا دے
میری شاموں میں رس بھر دے، راتوں کو آجائے نندیا
دن کو ہر سُو بکھریں اُجالے، ایسی کوئی جوت جلا دے
اے متوالے نینوں والی ! پریم پجاری کھڑا دوارے
دُکھیا من کی ہے یہ آشا، پیت اگنی سب پاپ جلا دے
پیت کے پھندے، برہا دھندے، راتوں کے اندھیارے جھولے
اے سجنی ! اک پردیسی کی پھلواری میں پھول کھلا دے
پربت، بن، بستی، ویرانے، مُکھ کے سُندر، من کے کالے
کون ہے اس بستی میں جو من کو امرت گھول پلا دے !

۱۱۔۷۔۱۹۵۵ء

پرانے ناسور

ان شہنشاہوں کی تاریخ میں رکھا کیا ہے
چند انسانوں کی خواہش کے پُراسرار مزار
اور ایک باب بڑھا دیتا ہے تاریخ نویس
جب کوئی ظلمِ شہنشاہ کی کرتا ہے پکار

اپنے حق کے لیے جب بھی کوئی آواز اٹھی
اس کو تاریخ نے بخشا ہے بغاوت کا خطاب
ان شہنشاہوں کے ملکوں کا نہیں کوئی شمار
تیرے ہر دانے کا، ہر قطرے کا ہوتا ہے حساب

تیری عظمت، تری رفعت، تری ہیبت کے طفیل
ان شہنشاہوں نے دنیا کو بنایا ہے غلام
لاکھوں انسانوں کے غلطیدہ بخوں ہونے پر
ایک انسان نے پایا ہے شہنشاہ کا نام

آج بھی جلتے ہیں شاہوں کے مقابر میں چراغ
جن کو ملتا ہے غریبوں کے لہو کا روغن
تیرے تاریک شبستاں میں اُجالا نہ ہوا
تیرا سینہ ہے تمنّاؤں کا ویراں مدفن

جس نے انسانوں پہ رکھا تھا روا ظلم، وہ آج
ابنِ آدم بھی ہے اور ابنِ شہنشاہ بھی ہے
تیری کوتاہی نے سمجھا ہے جسے ظلِ الٰہ
میری نظروں میں وہی سنگِ سرِ راہ بھی ہے

چند انسانوں کی بہبود نہیں سب کی فلاح
اوس کے قطرے بجھا سکتے نہیں باغ کی پیاس
اُن محلات کے سینوں سے لہو رِستا ہے
جن کی اینٹوں میں چھپی بیٹھی ہے معمار کی آس

ان کی تاریخ نے اکسایا ستم کوشی کو
اور ہر دور میں دہرایا گیا بابِ کہن
تیری اس شاہ پرستی نے کیا تجھ کو ہلاک
جیسے سبزے کو دیا سرو پرستی نے کفن

تیرے شاہوں نے اُتارا ہے خدائی کا لباس
دیکھ انساں ہیں، یہ انساں کے سوا کچھ بھی نہیں
اپنی بگڑی کو فقط تُو ہی بنا سکتا ہے
تیری امیدوں کی پروازِ دُعا کچھ بھی نہیں

ہر رگِ گُل میں رواں ہے تری محنت کا لہُو
انھیں پھولوں نے سجایا ہے شہنشاہ کا تاج
اپنی قوت کا اگر تجھ کو سہارا مل جائے
تیرے قدموں میں نظر آئینگے یہ پاٹ یہ راج

۲۳۔۳۔۱۹۴۶ء

نگارِ وفا

تمھاری یاد میں پنہاں ہے آرزوئے کمال
تمھاری دید سے اُبھرے گی صبحِ آزادی
حسیں گلاب لرزتے ہیں دستِ گل چیں میں
تمھاری رُوح سے پائے گا دادِ فریادی

زمانہ شانِ خدائی کی جلوہ پیمائی
تمھارا جلوہ مگر حاصلِ خداوندی
گلوں کا طرزِ کہن ہے زوال آمادہ
تمھارے حکم سے ہو گی نئی چمن بندی

تمھاری بزم میں روشن رہیں وہ قندیلیں
جنھیں بجھا نہ سکیں بادِ تند کی پیکیں

ہر ایک راہ پہ کیوں بہہ رہا ہے خونِ حیات
ہر ایک جادہ پہ استادہ ہیں بُتِ پندار
ہر ایک گام پہ بِکتا ہے کس لئے یوسفؑ!
ہر ایک راہگذر کیوں ہے مصر کا بازار!
زمانہ ایک مسلسل فریب ہی تو نہیں!
نہیں، نگارِ وفا ہے نہاں کہیں نہ کہیں!

۲۶-۲-۱۹۵۷

لاش

(۱)

زندگی بھر کی تمناؤں کی بر فاب سی لاش
ہے مری یاد کے تاریک شگافوں میں نہاں
جس طرح دُور ہمالہ کے سیہ غاروں میں
اک برو گرن کے تصور کا پیا بستا ہو

کس نے پالا مری اس لاش کو؟ معلوم نہیں
آہ! یہ اتنی بڑی لاش کہاں سے آئی!!

میں نے اس لاش کو مہتاب کو دینا چاہا
میں نے انساں سے کہا، بوئے گلستاں سے کہا
بہتے راوی سے کہا، سرو و صنوبر سے کہا
"میری اس لاش کو لے جاؤ، دبا دو جا کر
اس کو لے جاؤ بہت دُور، بہت دُور۔ کہیں
جس جگہ میرے گماں کا بھی گزر ہو نہ سکے"

لیکن اس لاش کے یخ بستہ تصور کا وجود
آج بھی یاد کے تاریک نہاں خانوں میں
تلخیٔ زیست کی قندیل جلا دیتا ہے!

(۲)

میں نے اس چاند کو راوی کے کنارے دیکھا
اپنے سینے سے لگائے ہوئے اک نور کی لاش
کہہ رہا تھا وہ ہر اک موج سے "اے یارِ قدیم!
میری اس لاش کو لے جاؤ، دبا دو جاکر
اس کو لے جاؤ بہت دُور ــــ بہت دُور کہیں
جس جگہ میری کرن کا بھی گذر ہو نہ سکے"

لیکن امواج نے جب سینوں کو اپنے چیرا
ہر حزیں سینے میں اک لاش نظر آتی تھی!

مجھ کو ہر موج کی ہر لاش نے روکا "ٹھہرو
زندگی ختم کرو ختم کرو امیدیں
دُکھ کے جنجال میں جلنے کا مزا کچھ بھی نہیں"

میں، مگر زیست کی اُمّید لئے، آس لئے
اپنے سینے سے لگائے ہوئے برفاب سی لاش
راستے وقت کے آباد کئے جاتا ہوں!

۲۷.۰۷.۱۹۵۵ء

تجدید حیات

میں نے سوچا تھا یہ پُرکیف بہاروں میں کبھی —

زندگی ہے تو شبِ ہجر بھی سہہ جاؤں گا
زندگی ہے تو شبِ ہجر گزر جائے گی
ظلمتِ درد سے نکلے گا مرا نورِ سحر
میرے ویران چمن پر بھی بہار آئیگی

لیکن اُس مرحلۂ سخت سے گزری ہے بہار
آج بے گور و کفن لاشہ ہے جینے کا خیال
آگہی دامِ تفکّر میں گرفتار ہوئی
آج، ہاں! آج، مرے دوست! ہے جینے میں کمال

ایک مجبور اُداسی ہے ہر اک شے پہ محیط
ہر طرف موت کے انبار ہیں ۔ انبارِ عظیم
کس نے اس گہری خموشی کو بچھا رکھا ہے
لے گیا کون مرا شور سے پُر عہدِ قدیم!

زندگی خواب نہ تھی، خواب بنی جاتی ہے
ڈر ہے یہ خواب، نہ بن جائے حقیقت میری
زندگی میرے لئے کشمکشِ زیست میں ہے
یوں نہ ہو جائے کہ مر جائے یہ فطرت میری

نغمۂ گوش نہیں شورشِ گیتی ہی سہی
کوئی ہنگامہ تو ہو معرکۂ زیست تو ہو
کس لئے بزمِ سخن چپ ہے ستاروں کی طرح
دوستو! کچھ تو کرو، ہم نفسو کچھ تو کہو

جا پہنچتی تھی جو گردوں کے شبستانوں میں
بربطِ زیست میں وہ نغمگی سی جھنکار نہیں
ساقیا! میں یہ کہوں گا تو شکایت ہوگی
تیرے میخانہ میں اب پہلے سے میخوار نہیں

ساقیا! پھر سے بُلا رندِ خرابات اپنے
پھر سے محفل کو سجا، بُجھتے چراغوں کو جلا
اپنی خوابیدہ نگاہوں سے اُٹھا دے پردے
ساقیا! ہوش میں، ہوش میں آ، ہوش میں آ!

ساقیا دیر نہ کر، جام پہ جام آنے دے
مجھ کو ہر حال میں، ہر دَور میں پینا ہوگا
مجھ کو پھر دل کے شگافوں سے نکلنا ہوگا
مجھ کو پھر کشمکشِ زیست میں جینا ہوگا!

ایک انسان ہوں، ہم صورتِ دیوار نہیں
میں خطاکار سہی، دل کا گنہگار نہیں!

۱۶-۹-۱۹۵۳ء

برہا اگنی

آ تجھ کو من کتھا سُناؤں
گیتوں کی مالا پہناؤں
لیکن میرے لب تاری کے
کیسے من کی بات بتاؤں !
کلی کلی پر بھنورا بیٹھا
مَیں کس کو جوبن دکھلاؤں !
یاد کے دن، فریاد کی راتیں
بِن ساجن بے کل گھبراؤں
سکھیوں میں ہنس ہنس روتی ہوں
کب تک سوکھے نیر بہاؤں
درپن کے بدلے تُو ہوتا
مُکھ دیکھوں مَیں شرما جاؤں
تُو آئے گا مَیں رُوٹھوں گی
سپنوں کا سنسار بساؤں !

۲۴-۱-۱۹۴۹

قطعه

اے میرے وطن! میں تری تقدیس کی خاطر
ہر حال میں، ہر گام پہ رہتا ہوں وضو سے
میں تیرا مورّخ بھی ہوں، تاریخِ زماں بھی
حالات رقم کرتا ہوں میں اپنے لہو سے

دھن والوں کے راج میں کھیلے میری تیری موت
دھن والا نر دھن کا بابا! کب ہوتا ہے یار!
اپنے بل سے واپس لے لے جیون کا سکھ چین
حیدرؓ کی تلوار ہے تو اور ٹیپو کی للکار

اک تبسم بھی محبت کا امیں ہوتا ہے
شرط یہ ہے کہ تبسم میں حیاداری ہو
حُسنِ معصوم وہ تارے کی کرن ہے جسکی
آنکھ میں نیند ہو اور رُوح میں بیداری ہو

گلشن میں خزاں ہو کہ بہاروں کا سماں ہو
صرف ایک صبا ہے جو سدا بہتی رہے گی
کیا گزری گلستاں کے مکینوں پہ خزاں میں
یہ اہلِ بہار اں سے صبا کہتی رہے گی

میرے محبوب کی زلفوں سے کہو میرا سلام
جن کے خوابوں میں نہاں ہے مری تخلیق کا راز
مجھ سے کیا پوچھتے ہو میری حقیقت کیا ہے!
میں ہوں اک سازِ شکستہ کی پریشاں آواز

تیری دنیا محفلِ بے ساز ہے
اک تھکی، ماندی، حزیں آواز ہے
اُس میں تیرا ایک تنکا بھی نہیں
جس چمن پر تجھ کو اتنا ناز ہے

کون جانے کہاں کھڑے ہیں ہم
کس سے پوچھیں کدھر کی راہ ہے یہ
دل لگانا گناہ سہی، لیکن
ہائے کتنا حسیں گناہ ہے یہ

آتشیں دھوپ نے کھیتوں کو جلا رکھا ہے
ابر آتا ہے تو بن برسے گزر جاتا ہے
وہ دہکتے ہوئے انگارے اگیں گے ان سے
آدمی جن کے تصور سے لرز جاتا ہے

اے مرے خوابوں کی رانی! مجھے آواز نہ دے
میرے افکار کے ہنگاموں کو بیدار نہ کر
ایک مفلس کی محبت کا بھرم رہنے دے
اپنے "زردار" کو رسوا سرِ بازار نہ کر

یہ گرد آلود سناٹے ہیں پنہاں شہرِ خاموشاں!
سکونِ ہمرہی کے ولولے بیدار ہوتے ہیں
یہ اتنے دن چڑھے تک کون محوِ خواب ہیں اس جا؟
یہاں منزل رسیدہ کارواں سالار سوتے ہیں

حسن کے بھاؤ میں تکرار تھی جھنکار رہی ہے
سسکیاں بھرتا ہوا بک گیا گمنام شباب
بزمِ زردار کے فانوسوں نے سب کچھ دیکھا
جن میں جلتی رہی مجبور تقدس کی شراب

ہے بکیر تنہائی میں ڈھلنا ہمیں منظور
ہم صحبت نا جنس گوارا نہیں کرتے
ہم غرقِ تلاطم ہوں کہ امواج سے کھیلیں
ساحل کے مکینوں کو پکارا نہیں کرتے

ایک کہسار کی وادی میں مری لاش ہو دفن
میرے آزاد وطن کے ہوں جو طفلانِ سعید
ہاتھوں میں پھول لئے آئیں، کہیں اتنا سخن
یہ ہے آزادی کا غازی، یہ ہمارا ہے شہید

ڈھونڈتا ہوں بستی بستی، قریہ قریہ، شہر شہر
ایک صورت جس میں حوّا کی جھلک ہو جلوہ گر!
ماہ پاروں کے وطن میں ظلمتوں کا زور ہے
رُوئے مشرق پر ہے طاری اہلِ مغرب کا ہُنر!

چاند اندھیرا، سُورج ٹھنڈا اور زمیں ہے آگ
پُروائی کے جھونکے بن گئے کالے ناگ
ماتا بالک کھا جاتی ہے، کھیت اُگائیں بھوک
روم جلا، جل راکھ ہوا اور نیرو گائے راگ

مانگ اپنی سیندور سے بھر کر مجھ سے ملنے کیا آتی ہو
مجھے تسلی تم کیا دو گی، تم تو خود ہو صبح کا تارا
تم کو اپنا راج مبارک، مجھ سے میرا درد نہ چھینو
تم کو کھو کر میرے جیون کا بس ہے یہ ایک سہارا

حق کے پیغام کی خاطر جو مرے ، وہ باغی
نقشِ افکار میں جو رنگ بھرے ، وہ باغی
میرے ماحول کی تفسیر کہاں ممکن ہے
جو یہاں ظلم کی فریاد کرے ، وہ باغی

جانے کس کارن برسوں سے من ہے ڈانواں ڈول
میں نے جس رادھا میں جھانکا، دیکھا اک ہی رُوپ
کیا وہ پیت کا پالن جانے! کیا منوا کی ریت!
کام دُھند لکے میلوں پھیلے، سایہ اور نہ دُھوپ

میری افسردہ نگاہی کی شکایت کیوں ہو؟
میرے ماحول میں ہر ایک ہے دُکھیا ، یارو!
کس سے فریاد کروں! کس سے کہوں قصۂ غم!!
جبکہ ظالم ہے مرے شہر کا مُکھیا ، یارو!

میں وہ کافر ہوں کہ بُت کو بھی خدا کہتا ہوں
تو وہ مومن ، کہ خدا کو بھی خدا کہہ نہ سکا
میں تو جاں دے کے بھی دیدار سے محروم رہا
تیرا دل صحبتِ محبوب کو بھی سہہ نہ سکا

ست جگ کے مانس کو بھگون! کلجگ میں لا ڈالا
ہر سُو مکر چرتر پھیلے، رِشی ہوئے سودائی
میرا من ہے رام چندر جی، سیتا میری آشا
لیکن جگ میں راون ہے یا راون کی ماں جائی

ہاتھ ٹٹولیں کچھ نہ پائیں، نینوں سے بھی دُور
کانوں کے کارن بن جاتا ہے یہ میری جان
بھگون جانے کیا ہے بابا! اس چھلیا کا نام
جیبھ تو اس کو راگ کہے ہیں، من کہتا ہے بان

آشا کا بیوپار نہ کرنا
منوا کو بیدار نہ کرنا
ناگ سے ڈسوا کر مر جانا
نِردھن ہو تو پیار نہ کرنا

ہر طرف ظلم کے سیلاب ہیں، سیلابِ عظیم
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں رہ سکتا
ظالم وقت مجھے خوں میں ڈبو دے، لیکن
میں کسی ظلم کو انصاف نہیں کہہ سکتا

بن گیا ہو جو کسی نقرئی مندر کا صنم
مجھ سے بے زر کا وہ غم خوار بنے تو کیسے
ایک معمار کے ہاتھوں نے گرایا ہو جسے
خود بخود آج وہ دیوار بنے تو کیسے!

آدمیت! تری تقدیس پہ جنت قرباں
تو سلامت رہے نغماتِ بہاراں بن کر
اپنے نغموں میں سمو کر تری عظمت کی لگن
میں ترے دل میں رہوں بوئے گلستاں بن کر

ہم شکوہ بلب جینے پہ مائل نہیں، یارو!
کونین عطا کرتے ہیں، سائل نہیں، یارو!
ہر ظلم جہاں سہہ کے بھی انصاف کریں گے
ظالم پہ بھی ہم ظلم کے قائل نہیں، یارو!

بند کلیوں کا کس لئے ماتم
یہ تو اک روز مسکرائیں گی
ہم کو لوٹا ہے جن بہاروں نے
وہ کبھی لوٹ کر نہ آئیں گی

حُسن کا کون طلب گار نہیں ہے، لیکن
ہر طلب گار تو زردار نہیں ہو سکتا!
میرا ایمان ہے یہ عالمِ امکاں ہے مگر
ایک مفلس سے یہاں پیار نہیں ہو سکتا!

ہم قوّتِ تعمیر سے معمور ہیں، پھر بھی
ہر کُٹیا کی دیوار میں سوراخ پڑے ہیں
کوتاہیٔ معمار کی زنجیروں میں جکڑے
ہم نعرہ زناں برسوں سے مجبور کھڑے ہیں

من کے مانند اگر تن بھی مرا ہوتا حسیں
حُسن و زیبائی میں مَیں یوسفِ ثانی ہوتا
عشق ہوں جو کہ مہ و سال کا پابند نہیں
حُسن ہوتا تو فقط تابہ جوانی ہوتا

ہر چند مَیں انسان سے کرتا ہوں محبّت
دُنیا میں اگر ہے تو وفا ہے مرا مطلوب
لیکن کسی ظالم کا بنوں گا نہ میں نخچیر
عیسیٰؑ کی طرح کبھی نہ سکو گے مجھے مصلوب!

بزمِ ناؤ نوش مجھ سے، تو مشیرِ محتسب
تو مجسّم حکمتِ عملی ہے، میں جنسِ حقیر
میرا چرچا کو بکو ہے تیری شہرت یم بہ یم
میں نے کی عصمت فروشی، تو نے بیچا ہے ضمیر

کچھ اس طرح حریفِ بیاباں بنیں گے ہم
مر کر نئی حیات کا عنواں بنیں گے ہم
زندہ رکھیں گے عہدِ بہاراں کی جستجو
صحنِ چمن میں روحِ بہاراں بنیں گے ہم

ذہن پر میرے تری زلفوں کے پیچ و خم محیط
اور مرے پاؤں میں تیرے باپ کی زنجیر ہے
دخترِ منصف! تری زلفیں حریرِ و پرنیاں
خواب کی میرے مگر دار و رسن تعبیر ہے

وہ مرا حال سُن کے روتے ہیں
یہ کہاں سے نئی ادا پائی!
میں تو خود کو بھی بھول بیٹھا ہوں
اُن کو کس وقت میری یاد آئی!

میرا جگ میں کوئی نہیں اب، سچ مچ میرا کوئی نہیں ہے
اس کو تو معلوم تھا سب کچھ، وہ کیوں مجھ کو چھوڑ گئی ہے؟
دارا! تو اک نردھن بن کر زر کی بازی ہار گیا ہے
وہ اک اہلِ زر کو پا کر، تجھ سے رشتہ توڑ گئی ہے!

پی کے ہزاروں جامِ ستم تیرے ہاتھ سے
ہم ڈگمگائے اور نہ اُڑے اپنے ہوش بھی
اس جرم کی ملے گی ہمیں دیکھیں کیا سزا!
تو محتسب ہمارا ہے اور مے فروش بھی

یا تو چنگیز بنی یا وہ ہلاکو نکلی،
جو بھی ہستی تری تعلیم سے پروان چڑھی
ظالمِ وقت! تری کاوشِ پیہم کے طفیل
جبر کے سائے بڑھے، صبر کی تلقین بڑھی

پنجۂ زیست میں ہر چند گرفتار ہیں ہم
پھر بھی ہم زیست کے معمار ہیں یہ یاد رہے
تو تو کُن کہہ کے فراغت سے ہوا گوشہ نشیں
اپنی کوشش ہے کہ دنیا تری دل شاد رہے

میں نے ہر دور میں ظالم سے بغاوت کی ہے
کون ہے جو مجھے اس دور میں مہمان کرے؟
ظالمِ وقت کو منظور ہے گر میری شکست
اس سے کہہ دو کہ مری موت کا سامان کرے!

صحنِ گلشن کی آبرو بن کر
دستِ گل چیں کے ظلم و جور سہے
جانے بچھڑے تھے کن بہاروں سے
عہدِ گل میں بھی گل اداس رہے!

کیوں ہم سے خفا محتسبِ شہر ہے، یارو!
ہم اس سے کسی دُکھ کی شکایت نہیں کرتے
ہاں! جرم ہمارا ہے اگر کوئی تو یہ ہے
ہم، کچھ بھی ہو، ظالم کی حمایت نہیں کرتے

شورِ شہنائی ہر راہ ہجومِ زن و مرد
ایسے نظارے کو دیکھیں تو خیال آتا ہے
کوئی فرہاد ہے مشغول کہیں تیشہ بدست
اور کسی شیریں کو پرویز لیے جاتا ہے

فرد

ابھی مرحوم محبت کو ابھی دفن نہ کر
جانے کب دل کے خرابے میں بہار آ جائے!

معصوم تصوّر ہی بڑی بات ہے یارو!
معصوم، خدا جانے، کوئی ہے کہ نہیں ہے

فلاسفو! اس شہزادی سے اظہارِ محبت کر دیکھو
قسمت کی غلامی دیکھ چکے قسمت سے بغاوت کر دیکھو

کہاں اُلجھائے گی اک روز ہم کو
تمنّا گیسوئے پُرپیچ و خم کی!

حُسن ہو، نور ہو، خدا ہو، علم ہو
زندگی کو اک سہارا چاہیے

کہاں سے لاؤں ترے لیے شوکتِ جہانگیر و قہرِ خسرو!
میں وہ گدا ہوں کہ ایک کُٹیا بھی جس کو حاصل نہیں جہاں میں

ہمیں بھی مرنے کی آرزو ہے مگر یہاں مر کے کیا ملے گا!
کفن ملا تو ملی نہ تربت، ملی جو تربت، کفن نہیں ہے

ساقی تری شراب میں تلخی کی ہے کمی
لا جام اس میں دردِ محبت نچوڑ دوں

کتنے افسانوں کو وہ لحظہ جنم دیتا ہے
جس میں ملتے ہیں سرِ راہ کبھی حسن و شباب

کبھی جو بھولے سے ہم لوگ مسکراتے ہیں
نہ جانے کس لئے گل ہم سے خار کھاتے ہیں!

زمانہ پھر کسی طوفاں کے انتظار میں ہے
خزاں کا رقصِ پریشاں تری بہار میں ہے

آج پھر کس کے روبرو ہے دل!
ایک طوفانِ آرزو ہے دل!

اپنی محفل میں مجھے دعوتِ گفتار نہ دے
جنبشِ لب بھی تو پیغامِ اجل ہوتی ہے

جب، جہاں بھی ملی، وہیں پی لی
مفلسی میں کچھ اختیار نہیں

بچ گئے بکنے سے، اک دردِ جگر، ایک خدا!
ورنہ اس دہر میں ہر شے کا بدل ہوتا ہے

ذوقِ نمود اُن کو ہے، مجھ کو ہے ذوقِ دید
پھر اُن کا اس قدر ہوں بھلا زیرِ بار کیوں!

تختۂ دار پہ جلّاد چراغاں کر دے
اب تو سب یارِ سرِ دار چلے آتے ہیں

تم تو ہر ایک سے بارنگِ کرم ملتے ہو
مجھ سے ملتے ہو تو احسان جتاتے کیوں ہو!

جی رہا ہوں تری دنیا میں مرے ربِّ جلیل
جس طرح ایک سیہ کار کی آغوش میں حور

سحر نویدِ حیاتِ گُل ہے، سحر پیامِ فنائے شبنم
کہیں تو کہنا پڑے گا سب کچھ، مگر مقامِ سخن نہیں ہے

مل جائے اک ذرا مجھے جینے کا آسرا
پھر دیکھئے گا میری طبیعت کے رنگ ڈھنگ

آ گئے ہیں تو اب چلے آئیں
آپ کا ورنہ انتظار نہ تھا

تیری زلفیں، تیرے بازو ہیں کہاں!
چھُو رہا ہوں اپنے احساسات کو

بھٹک بھٹک کے نہ مر جائیں تیرے دیوانے
وہ کہہ رہے ہیں کہ آباد ہوں گے ویرانے

ہم خدا کی تلاش میں نکلے!
خود خدا بن گئے خدا نہ ملا!

تُو اور اُن کا عشق، تری مفلسی کی خیر
دارا! یہ لوگ بکتے ہیں زردار دیکھ کر

غضب یہ ہے غریبوں کو بھی انساں کہہ دیا میں نے!
خزاں میں بھی گلستاں کو گلستاں کہہ دیا میں نے

مری مجبوریاں جب عکسِ ناکامی میں ڈھلتی ہیں
تمنائیں، شکستہ حال، بدنامی میں ڈھلتی ہیں

یہ چند اشک ہی اس میں نہاں نہیں، اے دوست!
کچھ اور بھی تری اس چشمِ سوگوار میں ہے

عنوانِ داستانِ غمِ ناتمام ہوں
جس کو ہو جستجوئے سحر میں وہ شام ہوں

جانے کیا بات ہے کہ زر پا کر
آدمی آدمی نہیں رہتا!

کتنے عنوان ہیں اس حسرتِ ناکام کے اب
ابتدا میں جسے محبوب کہا تھا میں نے

ایسا رونا سکھا دیا دل نے
مجھ کو آنسو بنا دیا دل نے

کہیں جو ہم خود سے پیار کر کے، نہایتِ اختیار کر دیں
تو تذکرہ مہرباں کا، نامہرباں کا اُٹھ جائے محفلوں سے

وطن سے دُور بھی ملتا ہے آب و دانہ ہمیں
مگر وہ کھیت، وہ فصلیں، وہ سبزہ زار نہیں

اس طرح مَیں درد میں ہوں، درد مجھ میں اس طرح
جیسے عنواں داستاں میں، داستاں عنواں میں ہو

میں ترکِ عشق کر دوں گا تمھاری بات پڑتا صحیح !
اگر جینے کی خاطر تم مجھے اک آسرا دے دو

جگر میں درد ہو، اور آنکھ اشک بار نہ ہو!
تری قسم کا مجھے آج اعتبار نہیں

ہماری خانہ بدوشی پہ مت ہنسو لوگو!
ہمیں نے بخشے ہیں تم کو یہ کاخ و کاشانے

تیرے احساسات ہیں تیرا حجاب
ورنہ تو اپنے لئے آئینہ ہے

اک تماشا بن گیا ہوں ان کے چھن جانے کے بعد
میں بھی خود کو دیکھتا ہوں، دیکھتے ہیں لوگ بھی!

قدم بڑھائے چلو، کارواں کے ساتھ رہو
دلوں کی بات مگر رہنما سے بھی نہ کہو

اب مجھے کون خریدے گا مرے عکس بتا!
میں وہ یوسف ہوں کہ خود اپنا خریدار نہیں!

شعلۂ زر! فرق ہم میں ہے تو صرف اتنا سا ہے
تُو جلاتا ہے جہاں کو اور میں اپنا جگر!

اجنبی بن کے ملیں گے اُن سے اب ہر گام پر
کاٹنا تھا ساتھ جن کے زندگی بھر کا سفر

کبھی دل ہر قدم پر اک نئی منزل کا طالب ہے
کبھی منزل پکارے بھی تو بن جاتا ہے بیگانہ

زمانہ اک مسلسل شورِ محشر سے نہ کم ہوتا
شکستِ آرزو میں بھی اگر کوئی صدا ہوتی!

[م جھ رل]

ہر روز جب صبح پھوٹتی ہے
تو شاعر کے سامنے دن کا زرد پہاڑ سینہ تانے آن
کھڑا ہوتا ہے جسکی چوٹی سے ایک تیز بھیانک چیخ
اسے اپنی طرف بلاتی ہے !

دِن کا زرد پہاڑ

ڈاکٹر وزیر آغا

کا نیا شعری مجموعہ — جس میں شاعر نے اژدھا
کے منہ میں جکڑے ہوئے ہرن کا سارا کرب سمو دیا ہے !
ایک انوکھی اور ناقابل فراموش تخلیق

طباعت : ونڈائیک آفسٹ

قیمت : تین روپے

جدید ناشرین

چوک اُردو بازار ○ لاہور

سرورق کی چھپائی "فنون پریس" لاہور میں ہوئی